POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 10-11 August 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages
8

HAMARI
ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 87 واں سال

Date of Publication: 09-08-2026 • Price: 5/- • 15-21 August 2026 • Issue: 31 • Vol:85

۱۵تا۲۱راگست ۲۰۲۶ء • شمارہ:۳۱ • جلد:۸۵

صحتِ زبان (۴۸)

روٴف پاریکھ

تجیئر نہیں، طنجہ

ہم نے اپنی ساتویں جماعت کی درسی کتاب میں ابنِ بطوطہ کے بارے میں پڑھا تھا کہ یہ جہاں گردِ اعظم طنجہ کا رہنے والا تھا۔ طنجہ ایک قدیم شہر ہے اور اب مراکش کا حصہ ہے۔ اس کا یہ نام اردو، فارسی اور عربی میں صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ لیکن اب ماشاء اللہ، چشمِ بد دور، بعض نوجوان صحافیوں کی معلومات اور اردو پر دست رس کا یہ عالم ہے کہ وہ اسے 'تجیئر' لکھتے ہیں۔

جب ہم نے ایک اردو اخبار میں ایک خبر کے آغاز میں 'تجیئر' لکھا دیکھا تو پہلے تو شرمائے کہ اس لفظ کا مطلب ہمیں نہیں معلوم تھا، پھر چکرائے اور گھبرائے۔ یا وحشت! یہ کیا لفظ ہے اور اس کے کیا معنی ہیں؟ کس زبان کا ہے؟ ابھی عربی فارسی کی لغات اٹھانے کا سوچ ہی رہے تھے کہ تجیئر کے آگے خبر کے متن میں 'مراکش کے شہر میں...' کے الفاظ نظر آئے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنی جہالت پر سر پیٹیں یا اس نوجوان نامہ نگار کی معلومات پر سر دُھنیں جس کی قابلیت ساتویں جماعت سے بہت آگے نکل گئی تھی اور جس نے انگریزی سے خبر کا ترجمہ کرتے ہوئے جب Tangier لکھا دیکھا تو بے دھڑک اسے اردو حروف کا پاجامہ پہنا دیا، یعنی تجیئر لکھ دیا، یہ سوچنے کی زحمت کیے بغیر کہ یہ اسلامی دنیا کا ایک قدیم شہر ہے اور مسلمانوں کی زبانوں یعنی عربی، فارسی، ترکی اور اردو میں اس کا کچھ نہ کچھ نام ہوگا، لیکن اُس افلاطونِ دوراں نے زندگی میں شاید کبھی لفظ 'طنجہ' لکھا ہوا نہیں دیکھا تھا (کیوں کہ چھٹی جماعت ہی سے اسکول سے بھاگ گیا تھا، مگر بضد تھا کہ اردو کے اخبار میں نوکری کروں گا)، لیکن پھر ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بعض لکھنے والوں کے برعکس اُس ارسطوے زماں نے مراکش کے انگریزی نام یعنی Morocco کو اردو میں 'مراکو' نہیں لکھ دیا حالاں کہ بعض جگہ یہ بھی لکھا دیکھا ہے۔

مغربی اقوام نے ہمارے بعض مشرقی ناموں کو اپنے تلفظ اور املا میں لکھنے کی کوشش کی ہے اور اپنی بعض صوتیاتی اور لسانیاتی مجبوریوں کے سبب انھیں اپنے رسمِ خط میں درست طور پر ظاہر نہ کر سکے، لیکن سوال یہ ہے کہ ہم ان کی نقالی کر کے اپنے رسمِ خط میں اپنے ناموں کو کیوں بگاڑیں؟

ثمرقند نہیں، سمرقند

حال ہی میں ازبکستان کے ایک شہر سے ایک خبر آئی اور بعض اردو اخبارات اور ٹی وی کے چینلوں نے بھی ازبکستان کے اس شہر کا نام 'ثمرقند' (یعنی ث سے) لکھا۔ حالاں کہ اس کا درست املا سمرقند (س سے) ہے۔

سمرقند دنیا کے ان تاریخی شہروں میں شامل ہے جو ایک طویل عرصے سے آباد ہیں اور کبھی اجڑے نہیں۔ ایک اندازہ ہے کہ سمرقند شہر تقریباً دو ہزار سات سو سال سے مسلسل آباد ہے۔ اس شہر کا نام صدیوں سے فارسی اور عربی بلکہ اردو میں بھی سمرقند لکھا جاتا ہے۔ صدیوں پرانے اس املا کو اب اچانک بدل کر غلط طور پر ثمرقند لکھنے کی وجہ شاید یہ ہے کہ ایک شربت کا نام ثمرقند ہے جو بوتلوں میں دست یاب ہوتا ہے۔ 'ثمر' کا مطلب ہے پھل اور 'قند' چینی یعنی کھانڈ یا شکر کو کہتے ہیں۔ شربت والوں نے تو نام مزے کا رکھا ہے لیکن شہر کا نام اتنا مزے دار نہیں ہے کیوں کہ سمرقند دراصل سُغدی زبان کا لفظ ہے۔ سُغدی ایک قدیم زبان تھی اور سُغد کے خطے میں بولی جاتی تھی جو وسط ایشیا میں واقع ہے۔ اسٹین گاس نے لکھا ہے کہ فارسی کے ان سات قدیم ڈائیلکٹوں میں سُغدی شامل تھی جو نابود ہو گئے۔ اسٹین گاس نے ایک ترکیب 'پیرِ سُغدی' بھی درج کی ہے اور مجازی معنی لکھے ہیں: سغد کا بوڑھا جو عمدہ مشورہ دے[1]۔ سُغد کے شہروں میں فرغانہ اور بخارا جیسے تاریخی شہر بھی شامل ہیں۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی سمر اور ثمر کی۔ سغدی زبان میں سمر (س سے) کے معنی ہیں پتھر اور قند کا مطلب ہے قلعہ یا شہر، گویا سمرقند (س سے) کا مطلب ہے پتھر کا شہر یا پتھر کا قلعہ۔ ازبکستان کا اور ایک شہر ہے تاشقند جو دارالحکومت بھی ہے۔ تاشقند کا بھی کم و بیش وہی مطلب ہے جو سمرقند کا ہے کیوں کہ اس خطے کی بعض ترکی النسل زبانوں میں لفظ 'تاش' کا مطلب پتھر ہے اور 'قند' وہی قلعہ یا شہر کے مفہوم ہے۔

اور 'س' سے سمرقند کا لفظ کس حد تک اردو میں رائج رہا ہے اس کا اندازہ یوں لگایئے کہ اقبال کے ہاں بھی سمرقند (س سے) ملتا ہے۔ بانگِ درا میں کہتے ہیں:

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلّی، نہ صفاہاں، نہ سمرقند

سمرقند کے مشہور اور تاریخی شہر کا املا بدل کر اسے ثمرقند لکھنے کی کوئی تُک نہیں ہے۔

اَولاد اور ولد

'ولد' کا لطیفہ بعد میں سنیے گا، پہلے یہ دیکھ لیجیے کہ اَولاد (واو لین) عربی میں جمع ہے ولد کی۔ سید رضوان علی ندوی کے مطابق وَلَد (واو مفتوح، لام مفتوح) کا لفظ عربی میں مفرد و جمع اور مذکر و موٴنث سب کے لیے استعمال ہوتا ہے[2]۔ عربی میں ولد کا مطلب ہے بچہ[3] لیکن اردو میں ولد کا مطلب بیٹا یا لڑکا یا فرزند ہے[4]۔ اردو میں ولد کے دو تلفظ رائج ہیں، لام مفتوح اور لام ساکن سے، مگر عربی میں اس کے چار تلفظ موجود ہیں[5]۔ اردو میں ولد کا لفظ استعمال تو ہوتا ہے لیکن زیادہ تر نام لکھتے وقت۔ نام کے بعد ولد کا لفظ لکھ کر باپ کا نام لکھا جاتا ہے، جیسے: احمد حسین ولد محمد حسین۔

البتہ ولد کی جمع یعنی اَولاد (واو لین) کا لفظ جمع ہونے کے باوجود اردو میں واحد کے طور پر آتا ہے اور اردو میں اولاد کے مفہوم میں بیٹا اور بیٹی دونوں شامل ہیں گو اسے مونث اور واحد کے طور پر برتا جاتا ہے، مثلاً: اس کی ایک ہی اولاد تھی۔ اور اگر کسی کا ایک بیٹا ہو تب بھی کہیں گے کہ اس 'کی' ایک اولاد ہے، حالاں کہ بیٹا مذکر ہے، ولد واحد ہے اور اولاد تو جمع ہے، لیکن اردو میں اولاد کا لفظ جمع کے بجائے واحد ہے اور مذکر کے بجائے مونث کے طور پر آتا ہے۔ یہ اردو کا تصرف ہے اور اردو کی حد تک بالکل جائز ہے۔

اردو والوں نے عربی کی جمع یعنی اولاد کو واحد مان کر اردو کے قاعدے سے اولاد کی جمع بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ 'مزید جمع' بھی بنالی ہے یعنی اولادیں۔ مثلاً: اس کی کتنی اولادیں ہیں؟ یا: اس کی اولادوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہی۔ جو لوگ اردو میں عربی الفاظ کے تصرف کے قائل نہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اردو میں عربی یا فارسی

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کر سکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

الفاظ کے املا یا مفہوم میں تصرف جائز نہیں اور اردو میں عربی فارسی الفاظ کو اسی طرح استعمال کرنا چاہیے جس طرح ان زبانوں کی صرف ونحو کے مطابق درست ہے، وہ 'اولاد' جیسے الفاظ کے اردو میں استعمال پر ذرا غور فرمائیں۔ لغت اور قواعد کے ضمن میں طالبِ علموں کو یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ اردو میں اردو کا استعمال ہی سند ہے، یعنی کوئی لفظ اردو میں کیسے برتا گیا ہے اور برتا جاتا ہے۔ ہاں جب عربی بولیں گے یا لکھیں گے تو عربی قواعد کا خیال رکھیں گے۔

اب 'ولد' کے غلط استعمال کا لطیفہ بھی سن لیجیے۔ کوئی بیس بائیس سال قبل جامعہ کراچی کے شعبۂ اردو نے تدریسِ اردو کے موضوع پر ایک سمینار منعقد کیا اور اس میں شہر بھر کے کالجوں سے اردو کے اساتذہ کو مدعو کیا۔ سمینار میں شریک اساتذہ کے کوائف کے اندراج کے لیے استقبالیے پر ایک رجسٹر رکھا گیا تھا اور تشریف لانے والے اساتذہ سے درخواست کی گئی کہ اپنا نام، والد کا نام، کالج کا پتا، فون نمبر وغیرہ اس میں لکھتے جایئے (تاکہ بعد میں رابطہ کرنے میں آسانی ہو)۔ مرد اساتذہ نے اپنا نام فلان ولد فلان لکھا اور ان کی دیکھا دیکھی خواتین بھی اپنے نام کے ساتھ 'فلان ولد فلان' (یعنی فلان بیٹا فلان کا) لکھتی گئیں۔ ہمارے دوست رفیق احمد نقش (افسوس مرحوم ہوگئے) اس پر بہت محظوظ ہوئے اور سیمینار کے بعد ہنس ہنس کر خواتین کے 'بیٹا' ہونے کا ذکر کرتے رہے اور ہم افسوس کرتے رہے کہ اردو میں ایم اے کر کے کالج میں اردو پڑھانے والوں کو بھی علم نہیں کہ اردو میں لڑکی 'ولد' نہیں ہوتی۔ اگرچہ عربی میں ولد کا لفظ مختلف مفاہیم میں آتا ہے لیکن اللہ کے ان ولیوں کو اردو میں بھی اس لفظ کے استعمال کا علم نہیں تھا، عربی کا تو ذکر جانے ہی دیجیے۔

دراصل ان خواتین کو چاہیے تھا کہ بِنت (ب کے نیچے زیر اور نون ساکن) لکھتیں۔ اردو میں ولد کی تانیث بِنت ہے جو عربی میں بیٹی کے مفہوم میں ہے۔ انھیں فلاں بِنتِ فلان لکھنا چاہیے تھا، مثلاً فائزہ بنتِ فرحان۔ فارسی کے حساب سے بنت کے بجائے 'دُختر' بھی لکھا جاسکتا ہے۔ لیکن خواتین بیٹی کے بجائے بیٹا بننے پر مُصِر تھیں۔

کیا 'اداکارہ' غلط ہے؟

اگر اردو میں عربی اور فارسی کے قواعد کی سختی سے پابندی کی جائے اور ان زبانوں کے الفاظ کو ان کی اصلی شکل میں لکھا اور بولا جائے تو ہماری زبان اردو تو اردو رہے گی ہی نہیں، بلکہ بقولِ سیّد سلیمان ندوی، اگر ان بدیسی الفاظ کو کھلی چھٹی دے دی جائے تو 'خود ہمارے ملک سے ہماری زبان کی حکومت اٹھ جائے گی'[۶] (اور یاد رہے کہ ندوی صاحب عربی کے فاضل تھے)۔ اگر اس طرح کی بندشیں اردو پر عائد کی جائیں کہ عربی کا قاعدہ یہ ہے اور فارسی میں یوں ہے تو شان الحق حقی صاحب کے بقول کیا اردو بولنا اور برتنا صرف ان لوگوں کا حق ہے جو عربی اور فارسی کے ماہر ہیں اور اگر ایسا ہے تو اردو کی ترویج کیسے ہوگی بلکہ اردو زبان کی بقا کا کیا ہوگا؟[۷]

اردو والوں نے بدیسی الفاظ کو اردو کے لسانی رنگ میں ڈھالنے کے لیے جو تصرفات کیے ہیں، اہلِ علم نے ان میں سے ایسے الفاظ و مرکبات کو درست مانا ہے جو اردو کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں بلکہ اہلِ علم اور اہلِ قلم خود بھی انھیں استعمال کرتے ہیں، یہ جانتے ہوئے کہ اصل زبان کی رو سے یہ غلط ہے۔ اس لیے کہ ان الفاظ کو بلاوجہ فارسی اور عربی قواعد کی رو سے جانچنا اردو کے دامن کو تنگ کرنے کے مترادف ہوگا۔ ایسے ہی الفاظ میں لفظ 'اداکارہ' بھی شامل ہے۔ یہ اداکار یعنی ایکٹر (actor) کی تانیث ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ الفاظ کے آخر میں 'ۃ' کا اضافہ کر کے تانیث بنانا عربی کا طریقہ ہے، اور اس 'ۃ' کو اردو اور فارسی والوں نے 'ہ' بھی بنا دیا ہے، مثلاً اردو میں شاعر کی مؤنث شاعرہ ہے۔ معلم کی معلّمہ، مسلم کی مسلمہ اور مومن کی تانیث مومنہ ہے۔

لیکن 'اداکار' (یعنی 'ادا' جمع 'کار') عربی نہیں ہے بلکہ اردو میں مستعمل فارسی ترکیب ہے۔ اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ اداکار کی تانیث اس لفظ کے آخر میں 'ہ' کا اضافہ کر کے نہیں بنائی جاسکتی۔ یہ خلافِ قاعدہ ہے کیوں کہ نہ 'ادا' یہاں عربی کا 'ادا' ہے اور نہ 'کار' عربی کا لفظ ہے، بلکہ 'کار' یہاں فارسی کا لفظ ہے اور فارسی میں بھی تانیث 'ہ' کے اضافے سے بنانے کا رواج نہیں ہے۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ہم اسے اردو میں استعمال کر رہے ہیں اور یہ اردو میں بالکل جائز ہے۔ کیوں کہ اداکار کا متبادل لفظ مُمَثِّل (تلفظ: مُمَث۔ ثِل) ہے اور اس کی تانیث مُمَثِّلہ (تلفظ: مُمَث۔ ثِلہ) ہے۔ لیکن یہ اتنے معرب اور ثقیل الفاظ ہیں کہ اردو میں ادبی متون میں بھی شاذ و نادر استعمال ہوئے ہیں اور عام زندگی میں ان الفاظ کے استعمال کا کیا سوال ہے۔ پس اداکارہ بالکل درست اور جائز ہے بلکہ فصیح ہے۔ اسی طرح گلوکارہ، فن کارہ بھی درست ہیں کیونکہ رائج ہیں اور 'غلط العام فصیح' کے درجے میں ہیں، خواہ اصل زبان کی قواعد کی رو سے غلط ہی کیوں نہ ہوں۔

جابر علی سید لکھتے ہیں:

> 'اداکارہ اور گلوکارہ قواعد کی رو سے غلط ہیں لیکن عام مقبولیت اور کشش کی بنا پر غلط العام ہوگئے ہیں۔ اداکار کا لفظ صدیِ رواں [بیسویں صدی] کی چوتھی دہائی کے اواسط سے پہلے موجود نہیں تھا۔ اس کے وضع اور رائج کرنے والے کا نام ہنوز تحقیق طلب ہے۔ زیادہ امکان آغا حشر کاشمیری کا ہے۔ عربی میں اداکار کے لیے مُمَثِّل کا لفظ ہے لیکن 'اداکار' میں فن کے ابتدائی تصور کا مفہوم 'ممثل' سے زیادہ معنی خیز ہے'[۸]۔

یہ اور بات ہے کہ آج کے دور میں تانیثیت یا فیمنزم کے ماننے والے کہتے ہیں کہ شاعرہ یا مدیرہ لکھنے یا بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ عورت اور مرد برابر ہیں اور دونوں کو شاعر، مدیر، اداکار، فن کار وغیرہ لکھنا چاہیے۔

دیکھا گیا ہے کہ انگریزی میں بھی اب ایکٹریس (actress) کا لفظ کم ہی استعمال ہوتا ہے اور خاتون اداکار کو بھی بسا اوقات ایکٹر (actor) ہی کہا جانے لگا ہے۔ یہاں تک کہ اب جانوروں میں بھی صنف کی تخصیص انگریزی والے اکثر نہیں کرتے اور مثلاً شیرنی کو lioness نہیں کہتے اور کبھی جنس کی وضاحت کرنی پڑے تو اکثر female lion کہتے ہیں، خاص طور پر سائنسی سیاق وسباق میں کیوں کہ لفظ lion کو اب صنفی طور پر غیر جانب دار (gender-neutral) کے طور پر گویا 'بلا تخصیصِ صنفی' استعمال کیا جاتا ہے گویا لفظ lion میں اب شیر اور شیرنی دونوں شامل ہیں۔ بالفاظِ دیگر صنفی تفریق یا صنفی تعصب (gender bias) کو جانوروں کے معاملے میں بھی اب جائز نہیں سمجھا جاتا۔

خیر، سرِ دست تو یہ عرض کرنا ہے کہ اردو میں اداکارہ، فن کارہ اور گلوکارہ وغیرہ رائج ہیں اور درست ہیں اور ان پر بلاوجہ عربی فارسی کے قواعد کا بوجھ ڈال کر انھیں ٹکسال باہر کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

حواشی:

۱۔ A Comprehensive Persian-English Dictionary (مرتبہ ایف اسٹین گاس F. Steingass)، (لاہور: سنگ میل، ۲۰۰۰ء) (عکسی طباعت، اشاعتِ اول ۱۸۹۲ء)۔

۲۔ رضوان علی ندوی، فرہنگِ تلفظ: ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ (مرتبہ رؤف پاریکھ)، (دہلی: انجمن ترقیِ اردو، ۲۰۲۴ء)، ص ۳۲۔

۳۔ مصباح اللغات (مرتبہ عبدالحفیظ بلیاوی) (لاہور: المصباح، سنہ ندارد)۔

۴۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد ۲۱ (کراچی: اردو لغت بورڈ، ۲۰۰۵ء)۔

۵۔ وارث سرہندی، کتب لغت کا تحقیقی ولسانی جائزہ، جلد ۲ (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء)، ص ۳۰۳؛ نیز مصباح اللغات، محولۂ بالا۔

۶۔ نقوشِ سلیمانی (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۷ء)، ص ۳۲۱ (دوسرا پاکستانی ایڈیشن)۔

۷۔ لسانی مسائل ولطائف (اسلام آباد: مقتدرۂ قومی زبان، ۱۹۹۶ء)، ص ۴۲-۴۱

۸۔ لسانی وعروضی مقالات (اسلام آباد: مقتدرۂ قومی زبان، ۱۰۸۹ء)، ص ۶۷۔

ریٹائرڈ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی-75270 (پاکستان)
E-mail: drraufparekh@yahoo.com

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

میرے مضامین (مجموعۂ مضامین ومقالات)	ڈاکٹر ماجد دیوبندی	300/-
نسخۂ حفیظ الدین احمد	اطہر فاروقی	1000/-
سرودِ عشق	شاہ رُخ جمال	200/-
گل دوگانہ	سیّد کاشف رضا	300/-
مشائخِ دہلی کی جامع تاریخ	پروفیسر شریف حسین قاسمی	700/-
مقالاتِ نظامی (پانچ جلدیں)	خلیق احمد نظامی	4500/-
نگینے لوگ (خاکوں کا مجموعہ)	معصوم مرادآبادی	250/-
ہمارا شہر اُس برس (گیتانجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	700/-
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا	سرور الہدیٰ	500/-
1857 کی اَن کہی حیرت انگیز داستانیں	شمس الاسلام	300/-
دیووں کا ظہور (الوک اگروال/ مینک اگروال)	مترجم: سیّد وجاہت مظہر	500/-
غزل اور فنِ غزل	ڈاکٹر نریش	200/-
فرہنگِ تلفظ: ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ سیّد رضوان علی ندوی	رؤف پاریکھ	250/-
مشاہیرِ ادب کے خطوط رشید حسن خاں کے نام	ابراہیم افسر	600/-
منیب الرحمٰن کی ایک صدی	بیدار بخت/ انور احمد	400/-
اردو املا اور حروفِ تہجی: لسانیاتی تناظر	رؤف پاریکھ	300/-
رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟	ڈاکٹر شمس بدایونی	300/-
غروبِ شہر کا وقت	اُسامہ صدیق	900/-
کچھ اُداس نظمیں	ہربنس مکھیا	300/-
میانِ من وتو (تحقیقی وتنقیدی مضامین)	پروفیسر شاہد کمال	500/-
میرا جنون اردو (خطبات ومضامین)	طاہر محمود	700/-
میر کی خودنوشت سوانح (نثار احمد فاروقی)	صدف فاطمہ	400/-
کلّیاتِ خطباتِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	400/-
آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر بشیر بدر	500/-
اداریے (مشفق خواجہ)	محمد صابر	500/-
انور عظیم کی ادبی کائنات	فیضان الحق	700/-
بچوں کا گلدستہ (پانچ جلدیں)	غلام حیدر	2400/-
تحقیق وتوازن	ڈاکٹر نریش	250/-
تحقیقی مباحث	رؤف پاریکھ	300/-
چند فکری وتاریخی عنوانات	پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن	400/-
ریت سمادھی (گیتانجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	900/-
حکمِ سفر دیا تھا کیوں	شانتی ویرکول	200/-
عہدِ وسطیٰ کی ہندستانی تاریخ کے چند اہم پہلو	اقتدار عالم خاں	350/-
قدرت کا بدلا (موسم کا بدلاؤ)	سیّد ضیاء حیدر	600/-
کتابیاتِ حالی	ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	300/-

قسط نمبر:4

مسائلِ لغت وقواعد اور رشید حسن خاں کے فکری ابعاد

ڈاکٹر ابراہیم افسر

گذشتہ سے پیوستہ

صابر سنبھلی کے نام 24 نومبر 1996 کو لکھے خط میں رشید صاحب نے لفظ ’پول‘ پر اُردو لغات کے حوالے سے بحث کی ہے۔ رشید صاحب اس خط سے قبل بھی اپنے دیگر خطوط میں پول اور شرم کے تذکیر و تانیث ہونے پر تفصیلی گفتگو کر چکے تھے۔ موصوف کے نزدیک دونوں لفظ مونث ہیں، لیکن لفظ پول کی وضاحت کے لیے انھوں نے فرہنگ آصفیہ، نور اللغات، اُردو لُغت (ترقی اُردو، بورڈ، کراچی) سے مثالیں پیش کیں۔ انھوں نے اس لفظ کو مذکر تسلیم کیا، لیکن ساتھ میں یہ بھی لکھا کہ اگر کوئی شخص اسے مونث لکھے تو اسے بھی صحیح مان لیا جائے گا۔ خط کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

’’’پول‘ کو صرف ایک لُغت ’اُردو لغت‘ (ترقی اُردو بورڈ، کراچی) میں مذکر اور مونث دونوں طرح لکھا گیا ہے؛ مگر مونث کی کوئی ایک مثال بھی درج نہیں کی گئی، مثالیں صرف مذکر کی لکھی گئی ہیں۔

ڈھول کا پول یا کی پول، نور اللغات اور فرہنگِ آصفیہ دونوں میں مندرج نہیں۔ نور میں ’ڈھول کے اندر پول‘ ضرور ہے، مگر اِس سے مفرد لفظ ’پول‘ کی تذکیر و تانیث ظاہر نہیں ہوتی۔ مفرد لفظ ’پول‘ نور میں ہے، مگر تذکیر و تانیث کی صراحت کے بغیر اور آصفیہ میں یہ سرے سے موجود ہی نہیں۔

اُردو لغت میں ’ڈھول کا پول‘ اور ’ڈھول کے پول‘ ہے۔ ’ڈھول کی پول‘ اس میں کہیں نہیں۔ ہاں ڈھول کا پول کھُلنا اور کھولنا، مندرج ہے، مگر اِس سے مفرد لفظ ’پول‘ کی تذکیر و تانیث ظاہر نہیں ہوتی۔

اب تک جس قدر مثالیں سامنے آئی ہیں، اُن میں ’پول‘ بہ تذکیر ہے، جیسے: ڈھول کا پول کھلنا، ڈھول کا پول کھولنا، ڈھول کا پول۔ ’’ڈھول کی پول‘‘ تحریر میں کہیں نہیں دیکھا گیا۔ ہاں سُنا ضرور ہے... کوئی دوسرا شخص ڈھول کی پول لکھے یا کہے، تو میں اُسے غلط تو نہیں کہوں گا، مگر ’ڈھول کا پول‘ اور ’پول کھل گیا‘ لکھوں گا۔ میں ’پول‘ کو مذکر مانوں گا۔ ہاں سماعت کی بنا پر ’کی پول‘ کو غلط نہیں کہوں گا۔ تذکیر و تانیث میں ایسی دورنگی عام ہے۔ مرجح صورت ہر صورت میں ’ڈھول کا پول‘ ہے‘‘۔[36]

اب رشید حسن خاں کا 2 فروری 2006 کا وہ خط ملاحظہ کیجیے جس میں انھوں نے لفظ ’ذ‘ پر مدلل بحث کی ہے۔ دراصل یہ خط لکھنے کی وجہ وہ بحث تھی جو ترجمان القرآن، لاہور میں متواتر شائع ہو رہی تھی۔ ترجمان القرآن میں امیر الدین مہر کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں انھوں نے رفیع الدین ہاشمی کے اس نظریے کو غلط ٹھہرایا جس میں کہا گیا تھا کہ لفظ ’ذ‘ فارسی زبان کا لفظ ہے۔ امیر الدین صاحب کے مطابق لفظ ’ذ‘ عربی زبان کا لفظ ہے۔ انھوں نے اپنے مفروضے کو ثابت کرنے کے لیے نسیم اللغات اور فیروز اللغات کے حوالے پیش کیے۔ رفیع الدین ہاشمی کے استفسار پر رشید حسن خاں نے ترجمان القرآن کے مدیر کے نام طویل خط لکھا جس میں رشید صاحب نے ثابت کیا کہ لفظ ’ذ‘ فارسی زبان کے حروفِ تہجی میں شامل ہے۔ البتہ مرزا غالب نے اپنے خطوط میں اس بات پر زور دیا تھا کہ لفظ ذال فارسی کے حروفِ تہجی میں شامل نہیں ہے۔ انھوں نے برہانِ قاطع میں بھی اس امر کا اظہار کیا تھا لیکن اہلِ علم نے ان کے استفسار کو قبول نہیں کیا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، قاضی عبدالودود، پروفیسر نذیر احمد وغیرہ نے اپنے مضامین میں بھی یہ ثابت کیا کہ لفظ ذ اصلاً فارسی زبان کا لفظ ہے۔ اسی طرح ممتاز ایرانی زبان شناس اور لُغت نویس ڈاکٹر معین نے بھی ذال کو فارسی زبان کا لفظ قرار دیا۔ اس طویل خط کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

’’مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ لسانیات سے متعلق مسائل میں تھوڑا سا مطالعہ کام نہیں آتا۔؛ اِس لیے ضروری ہے کہ مفصل مطالعہ کیا جائے؛ یہ بھی ضروری ہے کہ لسانیات اور صوتیات کے اصولوں سے اور طریقِ کار سے واقفیت بہم پہنچائی جائے۔ ظاہر ہے اس کے لیے اچھا خاصا وقت درکار ہے جن اہلِ علم نے ایسے اہم مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے، انھوں نے عمرِ عزیز کا بڑا حصہ اس کی نذر کیا ہے۔ مزید یہ کہ ایسے اہم مسائل میں نسیم اللغات جیسے لغت کا حوالہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ اگر مکتوب نگار کی رائے میں ذال فارسی کا حرف نہیں تو اہم فارسی مآخذ کا حوالہ دیا جانا چاہیے تھا۔ فیروز اللغات اور نسیم اللغات جیسے لغت طلبہ کے لیے کارآمد ہو سکتے ہیں، لسانی مسائل میں اُن کو بہ طورِ کتاب حوالہ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بھی عرض کرنا ہے کہ کچھ اور وقت صرف کر کے اگر اُن سب تحریروں کو پڑھ لیا جاتا جو پچھلے ساٹھ ستّر برسوں میں ذال سے متعلق لکھی گئی ہیں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ ذال فارسی کے حرورفِ تہجی میں شامل ہے۔ یہ اُن حروف میں سے ہے جو عربی اور فارسی میں مشترک ہیں اور یہ کہ فارسی زبان کے بہت سے لفظوں میں اصلاً ذال ہے، ایسے لفظوں کو زے سے لکھنا قابلِ قبول نہیں... ذال اُن آٹھ حرفوں میں شامل نہیں جو عربی سے مخصوص ہیں۔ مختصر یہ کہ ذال کے مسئلے پر ماہرینِ زبان و لُغت نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اُس کو پڑھے بغیر رائے ظاہر کرنا مناسب نہیں، اس سے طلبہ میں اور عام لوگوں میں غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے اور غلط فہمی ایک بار پیدا ہو جائے تو پھر بہت مشکل سے دور ہو پاتی ہے۔‘‘[37]

مالک رام صاحب نے رشید صاحب کے نام 27 دسمبر 1961 کو خط لکھا جس میں انھوں نے خاں صاحب کے مضمون قاموس الاغلاط پر ایک نظر، جو سہ ماہی رسالہ اُردو ادب، علی گڑھ میں شائع ہوا تھا، پر مبارک باد پیش کی۔ اس خط کے درمیانی حصے میں مالک رام صاحب نے اپنی ذاتی رائے پیش کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ مضمون میں بحث کے بعد تمام الفاظ کی فہرست جدول کی شکل میں ہونی چاہیے تھی تاکہ لفظوں کی اصل ساخت کی پہچان ہو سکے۔ اس خط میں رشید صاحب کی اس بات پر بھی تعریف کی گئی کہ جس لغت پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے اسے کتنے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ رشید صاحب نے جب یہ مضمون تحریر کیا اُس وقت ان کی عمر 36 برس تھی۔ خط کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

’’اُردو ادب کا وہ شمارہ موصول ہوا جس میں آپ کا مضمون ہے۔ ماشاء اللہ بہت مفصل اور تمام امور پر حاوی رہا۔ مجھے واقعی بہت پسند آیا۔ آپ کو چاہیے تھا کہ شروع ہی میں متن میں یا حاشیے میں اس کا اظہار کر دیتے کہ قاموس الاغلاط کے مولف یا مصنف کون ہیں، یہ کس مطبعے میں، کس سال چھپا۔ تعجب ہوتا ہے کہ آپ نے اس امر کی طرف تو اشارہ کیا کہ اسے دو صاحبوں نے تالیف کیا، لیکن اُن کے نام لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے بعض نوجوان لکھنے والوں نے نہ کبھی کتاب کا نام سُنا ہوگا نہ مولفوں کا۔ دوسری کمی یہ محسوس ہوئی کہ پوری بحث کے بعد آخر میں تمام الفاظ کی فہرست جدول کی شکل میں درج کرنا چاہیے تھی یعنی اصلی لفظ، کس زبان کا ہے، اُس میں اِس کے اعراب، اب اُردو میں شکل وغیرہ۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا کہ قاری بہ یک نظر ساری بحث کے مطالب کو دیکھ سکتا تھا۔‘‘[38]

رشید حسن خاں نے یکم جنوری 1973 کو خواجہ حسن ثانی نظامی کے نام لکھے تہنیت نامے میں بارات اور عرب سرائے پر تحقیقی روشنی ڈالی ہے۔ ان کی نظر میں لفظ ’بارات‘ درست نہیں بل کہ اس کی درست شکل ’برات‘ ہے۔ جب کہ عرب سرائے کے متعلق ان کا گمان ہے کہ دہلی کے اہلِ زبان کی نظر میں یہاں کہ لوگ فصیل بند شہر کے باہر کے رہنے والے لوگ ہیں۔ خط کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

’’ارے ہاں، ایک بات رہے جا رہی تھی، اپنی خوے نکتہ چینی سے مجبور ہوں۔ دعوت نامے میں بارات کا لفظ بہت کھٹکا بل کہ چُبھا اور سب برات کو بارات لکھیں شوق سے لکھیں مگر آپ نہیں لکھ سکتے۔ آپ کا گھر زبانِ دہلی کا احاطہ رہا ہے اور اُس احاطے کے بس سامنے ہی عرب سرائے کی چہار دیواری ہے جہاں اُردو کے سب سے بڑی لغت نویس کے آبا و اجداد رہا کرتے تھے۔

یہ بات تو ختم ہوئی، مگر عرب سرائے کے نام پر ایک لطیفہ یاد آ گیا، لطیفہ کیوں واقعہ۔ داغ سے کسی نے پوچھا کہ فرہنگِ آصفیہ کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے، خاموش رہے، بس اتنا کہا کہ سید احمد، عرب سرائے کے رہنے والے تھے، مطلب یہ کہ فصیل باہر کے تھے۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے اُس چہار دیواری کے تصور کو! ہائے ہائے کیسے وضع دار تھے یہ لوگ، بخشتے نہیں تھے۔‘‘[39]

19 جون 1997 کو پروفیسر شیام لال کالرا عابد پیشاوری کے نام لکھے خط میں رشید حسن خاں نے اس بات پر زور دیا کہ اُردو میں ہندو مائتھالوجی سے متعلق لُغت کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اپنی بات کی تصدیق کے لیے اُردو ادب میں موجود ہندو مائتھالوجی ادبی روایات کو کالرا صاحب کے سامنے پیش کیا۔ اگر ہم غور کریں تو ہمیں ایسا کوئی لُغت نظر نہیں آتا جس میں ہندو مائتھالوجی پر بات کی گئی ہو۔ رشید صاحب نے کالرا صاحب کو اس بات پر اُبھارا کہ وہی اس اہم کام کو انجام دے سکتے ہیں۔ انھوں نے اس اہم کام کے لیے لُغت کا نام ’اُردو ادب میں مستعمل ہندو مذہب کے اصطلاحی اور اساطیری الفاظ کا توضیحی لُغت‘ تجویز کیا۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ ہندی میں موجود اس طرح کے لغات سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں موصوف نے کالی داس گپتا رضا کے پاس موجود ہندی اساطیری لغت کا حوالہ بھی پیش کیا۔ لُغت کے موضوع پر لکھے گئے اس خط کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

’’اُردو میں ایک اچھی لغت کی اشد ضرورت ہے ہندو مائتھالوجی سے متعلق بیسیوں اشعار میں ایسے حوالے ...

(بقیہ صفحہ 7 پر)

اردو دُنیا

حضرت امیر خسروؔ سپاہی، شاعر، مورخ اور ماہرِ موسیقی تھے

پروفیسر اختر الواسع

نئی دہلی (21 جولائی)۔ غالب اکیڈمی، نئی دہلی کے زیرِ اہتمام وزارتِ ثقافت حکومتِ ہند کے تعاون سے 'حضرت امیر خسرو: اردو اور ہندی کے پہلے شاعر' کے عنوان سے ایک علمی و ادبی جلسے کا انعقاد کیا گیا، جس میں ممتاز ماہرینِ ادب اور دانشوروں نے حضرت امیر خسرو کی لسانی، ادبی اور ثقافتی خدمات پر تفصیلی اظہارِ خیال کیا۔ ہندی کے معروف پروفیسر جانکی پرساد شرما نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ زبان کے حوالے سے حضرت امیر خسرو کا نظریہ نہایت معتدل تھا اور اردو و ہندی کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ حضرت امیر خسروؔ عہدِ وسطیٰ کے ہندستان کی ایسی ہمہ گیر شخصیت تھے جنھیں صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی عقیدت اور احترام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ امیر خسروؔ صوفی، سپاہی، شاعر، مورخ اور ماہرِ موسیقی تھے اور فارسی و ہندی دونوں زبانوں میں شاعری کی۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر سیّد فاروق نے کہا کہ حضرت امیر خسرو نے اپنی زبان میں برج بھاشا کا استعمال کیا اور اردو ہندستان ہی میں پروان چڑھی۔ انھوں نے پہیلیاں بھی لکھیں، جب کہ ان کا نعتیہ اور منقبتی کلام بھی بے حد مقبول ہے۔ ڈاکٹر جی. آر. کنول نے کہا کہ حضرت امیر خسرو نے آٹھ بادشاہوں کا دور دیکھا اور عربی، فارسی اور ترکی سمیت متعدد زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ امیر خسروؔ عوام اور بچوں، دونوں کے شاعر تھے اور سنسکرت سمیت ہندستان کی تمام زبانوں سے محبت رکھتے تھے۔ تقریب کے دوران اردو سیکھنے والے طلبہ میں اسناد بھی تقسیم کی گئیں۔ اس جلسے میں بڑی تعداد میں طلبہ، اساتذہ، دہلی ہائی کورٹ کے وکلا اور علمی و ادبی شخصیات نے شرکت کی، جن میں ظہیر احمد برنی، ہریش رائے، ڈاکٹر نگار عظیم، شاہد انور، خوسے مورالیس، معین شاداب، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر معظم الدین، ڈاکٹر سنتوش سمپرتی، ڈاکٹر شاہد حبیب، ڈاکٹر حنا آفرین، حشمت بھاردواج، ثروت عثمانی، ڈاکٹر مدن رائے، سلیم دہلوی، احترام صدیقی، فرقان علی، سورج پال ادنیٰ، کے. ایم. شرما، انور خاں ایڈوکیٹ، ابونعمان، عارف حسین، مسز خورشید، سیّد حفظ الرحمٰن، پروین ویاس، ڈاکٹر انوپما سری واستو، مینک آسٹن صوفی، شری کانت کوہلی اور کمال الدین شامل تھے۔ آخر میں غالب اکیڈمی کے سکریٹری عقیل احمد نے تمام مقررین، مہمانوں اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ (انقلاب۔ دہلی)

خواتین کمیشن کے بعد اردو اکادمی اور وقف بورڈ کی تشکیلِ نو کا مطالبہ

نئی دہلی (29 جولائی)۔ دہلی حکومت کی جانب سے حال ہی میں دہلی خواتین کمیشن اور دہلی اقلیتی کمیشن کی تشکیلِ نو کے اعلان کے بعد اب مختلف سماجی، تعلیمی اور ادبی حلقوں نے اردو اکادمی دہلی اور دہلی وقف بورڈ کی بھی جلد از جلد تشکیلِ نو کا مطالبہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دونوں ادارے ایک طویل عرصے سے مکمل فعالیت کے ساتھ کام نہیں کر پا رہے جس کی وجہ سے اردو زبان، ادبی سرگرمیوں اور وقف املاک کے انتظام سے متعلق متعدد امور متاثر ہو رہے ہیں۔ شیخ علیم الدین اسعدی نے کہا کہ خواتین کمیشن اور اقلیتی کمیشن کی تشکیلِ نو کے بعد حکومت کو چاہیے کہ اردو اکادمی اور وقف بورڈ کے معاملات کو بھی ترجیحی بنیادوں پر نمٹائے تاکہ عوام کے درمیان یہ تاثر پیدا ہو کہ حکومت تمام اہم اداروں کو یکساں اہمیت دے رہی ہے۔ فیروز مظفر حنفی نے کہا کہ اردو اکادمی کے تحت منعقد ہونے والے ادبی پروگرام، مشاعرے، سمینار، کتابوں کی اشاعت اور طلبہ کی حوصلہ افزائی جیسے منصوبے متاثر ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ نئی کمیٹی کے قیام سے اردو زبان کے فروغ کو نئی رفتار ملے گی۔ وقف امور کے واقفیت رکھنے والے شاہد گنگوہی نے کہا کہ دہلی وقف بورڈ کی جلد تشکیلِ نو وقت کی اہم ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ وقف املاک کے تحفظ، شفاف انتظام اور عوامی مفاد کے منصوبوں کو موثر بنانے کے لیے ایک فعال وقف بورڈ ناگزیر ہے۔ سماجی کارکن حاجی محمد اسعد میاں نے کہا کہ اردو اکادمی دہلی نے ماضی میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے نمایاں کردار ادا کیا ہے، لیکن کمیٹی تشکیل نہ ہونے کی وجہ سے اس کی سرگرمیاں محدود ہو گئی ہیں۔ انھوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ اہل اور تجربہ کار شخصیات کو شامل کر کے اکادمی کو دوبارہ فعال بنایا جائے۔ (انقلاب۔ دہلی)

اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر سیّد عین الحسن کی مدت میں توسیع

حیدرآباد (23 جولائی)۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (مانو) کے وائس چانسلر پروفیسر سیّد عین الحسن کی مدتِ کار میں باضابطہ طور پر توسیع کر دی گئی ہے۔ پروفیسر اشتیاق احمد (رجسٹرار) نے اس سلسلے میں ایک اعلامیہ جاری کیا ہے۔ اعلامیہ کے مطابق محکمۂ اعلا تعلیم، وزارتِ تعلیم، حکومتِ ہند کی جانب سے موصول ہوئے مکتوب مورخہ 22 جولائی کے بموجب صدر جمہوریۂ ہند نے بحیثیت وزیٹر یونیورسٹی یہ توسیع کی ہے۔ واضح رہے کہ پروفیسر سیّد عین الحسن کو 23 جولائی 2021 کو اردو یونیورسٹی کا پانچواں وائس چانسلر مقرر کیا گیا تھا اور انھوں نے 28 جولائی کو اپنے عہدے کا چارج لیا تھا۔ پروفیسر سیّد عین الحسن اپنی مدتِ کار میں یونیورسٹی کو ترقی دینے کے لیے مسلسل کوشاں رہے۔ انھی کے دور میں یونیورسٹی کو نیک کی جانب سے 'A+' گریڈ حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ QS عالمی رینکنگ اور NIRF کی قومی رینکنگ میں مانو کو بہتر مقام ملا۔ قومی تعلیمی پالیسی کے تحت لاء اسکول کا قیام عمل میں آیا جہاں ایل ایل بی اور دیگر کورسز چلائے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف اختراعی کورسز کا بھی آغاز کیا گیا۔ ان کی خاص دل چسپی سے وارانسی کیمپس کا قیام عمل میں آیا جہاں بی ایڈ کالج کے علاوہ فاصلاتی تعلیم کے خواہشمند طلبہ کے لیے ریجنل سنٹر بھی قائم کیا گیا۔ انھیں جنوری 2025 میں حکومت کی جانب سے پدم شری سے بھی نوازا گیا۔ ان کی میعاد میں توسیع پر یونیورسٹی کے رجسٹرار پروفیسر اشتیاق احمد، اساتذہ، غیر تدریسی عملہ اور طلبہ نے انھیں مبارک باد پیش کی۔ (انقلاب۔ دہلی)

'انتساب عالمی' کے انجم بارہ بنکوی نمبر کی رونمائی

سرونج (28 جولائی)۔ انتساب پبلی کیشنز اور سدبھاؤنا منچ کے زیرِ اہتمام سیفی لائبریری، سرونج میں سہ ماہی 'انتساب عالمی' کے خصوصی 'انجم بارہ بنکوی نمبر' کی رسمِ اجرا کے ساتھ ایک باوقار ادبی نشست اور مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ تقریبِ رونمائی کی صدارت سابق آئی اے ایس افسر ایم ڈبلیو انصاری نے کی، جب کہ مرزا عظیم بیگ مہمانِ خصوصی تھے۔ تقریب کا آغاز سہ ماہی 'انتساب' کے مدیر سرونجی کے خیر مقدمی کلمات سے ہوا، جب کہ کلیدی خطبہ معروف ادیب ڈاکٹر مہتاب عالم نے پیش کیا۔

ڈاکٹر مہتاب عالم نے کہا کہ انجم بارہ بنکوی نے اپنی شاعری میں ہندستانی تہذیب اور استعاروں کو نہایت خوب صورتی سے برتا ہے۔ صدارتی خطاب میں ایم ڈبلیو انصاری نے کہا کہ 'انتساب عالمی' کا یہ خصوصی شمارہ سنجیدہ مطالعے کا متقاضی ہے۔ انھوں نے سرونج کو گنگا جمنی تہذیب کا حسین سنگم قرار دیتے ہوئے سیفی سرونجی اور سدبھاؤنا منچ کے صدر انل اگروال کو اس کامیاب ادبی کاوش پر مبارک باد پیش کی۔ وجے تیواری نے کہا کہ انجم بارہ بنکوی کی شاعری میں انفرادیت اور خود اعتمادی نمایاں ہے جو انھیں دیگر شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ تقریب سے حسام الدین فاروقی، قمر علی شاہ، جاوید نعمانی، نصرت علی، تسنیم راجا، ظفر سرونجی، سیّد عروج احمد، اسعد ہاشمی، خان آشو اور فرحان خاں سمیت متعدد اہلِ قلم نے بھی اظہارِ خیال کرتے ہوئے انجم بارہ بنکوی کی ادبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ رسمِ اجرا کے بعد ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں ساجد پریمی، ساجد ہاشمی، حبیب سرور، ایس ایم سراج، سلیمان مجاز، اقبال منظر، عظمت دانش، سہیل نسیم، دولت رام، ولی اللہ ولی سمیت متعدد مقامی شعرا نے اپنا کلام پیش کیا اور حاضرین سے خوب داد وصول کی۔ تقریب کی نظامت استوتی اگروال نے کی، جب کہ آخر میں منتظمین نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (انقلاب۔ دہلی)

اردو مرثیے کے ارتقائی سفر کو داستان گوئی کے منفرد انداز میں پیش کیا گیا

نئی دہلی (27 جولائی)۔ جشنِ بہار ٹرسٹ اور انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر کے اشتراک سے انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر میں کربلا سے کاشی تک داستان مرثیہ کے عنوان سے ایک منفرد ادبی تقریب منعقد ہوئی، جس میں شاعری، داستان گوئی اور خصوصی نمائش کے ذریعے اردو مرثیے کے تاریخی اور تہذیبی سفر کو اجاگر کیا گیا۔ تقریب کے مہمانِ خصوصی انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر کے صدر سلمان خورشید تھے۔ پروگرام میں اردو مرثیے کے ارتقا کو نہ صرف ایک اہم ادبی صنف کے طور پر پیش کیا گیا بلکہ اسے ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت بھی قرار دیا گیا۔ اس موقعے پر جشنِ بہار ٹرسٹ کی بانی کامنا پرساد نے کہا کہ اردو مرثیہ امام حسین کی عظیم داستان کے کربلا سے کاشی تک کے سفر کی نمائندگی کرتا ہے اور یہ دنیا کی منفرد ادبی صنف ہے جس میں المیہ، رزمیہ اور نوحہ ایک ساتھ سمٹ آتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مرثیہ ہندستانی سماج، تہذیب اور مشترکہ ثقافت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا رہا ہے اور مختلف مذاہب و برادریوں کے درمیان ہم آہنگی کا ذریعہ بھی ہے۔ کامنا پرساد نے بتایا کہ اس موقعے پر منعقدہ خصوصی نمائش میں ہندستان میں مرثیہ نگاری کی روایت، اس کے تاریخی سفر اور گنگا جمنی تہذیب سے اس کے تعلق کو دل چسپ انداز میں پیش کیا گیا۔ داستان گوئی کی ہدایت کاری کا فریضہ کامنا پرساد نے انجام دیا، جب کہ نوجوان فنکار عناب خضر اور فیروز خاں نے داستان گوئی پیش کی۔ اس ادبی سفر میں ابھرتے ہوئے شاعر پلّو مشرا بھی شریک رہے۔ ابتدائی کلمات میں سابق آئی پی ایس آفیسر قمر احمد زیدی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ سنٹر میں ہر سال یومِ حسین منایا جاتا ہے اور اس سال اسی مناسبت سے کربلا سے کاشی تک داستانِ مرثیہ کے عنوان سے خصوصی پروگرام کا اہتمام کیا گیا۔

اپنے صدارتی خطاب میں سلمان خورشید نے کہا کہ اس نوعیت کی ادبی تقریبات مشترکہ تہذیب اور گنگا جمنی ثقافت کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ انھوں نے بڑی تعداد میں شریک ہونے والے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اختتامی خطاب میں کامنا پرساد نے حاضرین کی بھرپور شرکت اور محبت پر اظہارِ تشکر کرتے ہوئے کہا کہ لوگوں نے نشستیں نہ ملنے کے باوجود فرش پر بیٹھ کر داستان گوئی سنی، جو اس پروگرام کی کامیابی کا ثبوت ہے۔ تقریب کے اختتام پر انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر کے نائب صدر محمد فرقان نے کلماتِ تشکر ادا کرتے ہوئے حضرت امام حسین کی تعلیمات پر عمل کرنے اور حق، انصاف، ایثار اور انسانیت کی اقدار کو فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ (انقلاب۔ دہلی)

یوپی میں سرکاری ادارے اردو کو فروغ دینے میں غیر فعال

لکھنؤ (28 جولائی)۔لکھنؤ کو اردو ادب کی تاریخ میں ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل رہا ہے۔ یہ شہر صرف تہذیب، شائستگی اور فنونِ لطیفہ کا مرکز ہی نہیں بلکہ اردو زبان و ادب کی نشوونما، ترویج اور ارتقا کا بھی اہم گہوارہ رہا ہے۔نوابینِ اودھ کے دور سے لے کر موجودہ زمانے تک لکھنؤ نے اردو ادب کی آبیاری میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، اس کے بعد بھی اردو کے فروغ کے لیے حکومتوں کے ذریعے مختلف اقدام کیے جاتے رہے ہیں۔

اس سلسلے میں جہاں اتر پردیش اردو اکادمی اور فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے ذریعے ماضی میں نمایاں کام انجام دیے گئے وہیں اردو ادب کو نئی نسلوں تک پہنچانے کا کام مقامی سطح پر مختلف تنظیموں اور دیگر اداروں کے ذریعے مسلسل کیا جاتا رہا ہے لیکن وقت اور حالات بدلنے کے ساتھ ہی حکومت کی سرپرستی میں کام کرنے والے ادارے تنگ نظری کا شکار ہوتے چلے گئے، حالاں کہ لکھنؤ کے ساتھ ہی دیگر اضلاع میں چھوٹی چھوٹی تنظیمیں آج بھی اردو کو بچانے کے لیے جدوجہد کررہی ہیں۔آج حالات یہ ہیں کہ گذشتہ کئی سال سے اتر پردیش اردو اکادمی اور فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کی مجلسِ عاملہ کی تشکیل نو نہیں ہوسکی ہے جس کے سبب ادبا اور شعرا، طلبہ اور ملازمین کے معاملات زیرِ التوا ہیں۔ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کو چار برس سے انعامات کا انتظار ہے، ساتھ ہی طلبہ کی اسکالرشپ میں اضافہ، نئی کتابوں کی اشاعت، مستحق ادیبوں کے وظیفوں کی منظوری، اردو کے فروغ کے لیے نئی اسکیموں کا آغاز اور ملازمین کا پرموشن جیسے کئی اہم منصوبے بھی تعطل کا شکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کے اسی تاریخی مرکز لکھنؤ میں اِن دنوں اردو حلقوں میں تشویش کے ساتھ بے چینی پائی جارہی ہے۔ادبی حلقوں سے وابستہ لوگوں کا کہنا ہے کہ اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے قائم اہم اداروں کا طویل عرصے تک فعال انتظامی ڈھانچے سے محروم رہنا اردو کے تئیں سرکاری عدمِ توجہی کو ظاہر کرتا ہے۔

واضح ہو کہ شہر کی شناخت مشاعروں اور ادبی نشستوں کے حوالے سے بھی ہمیشہ نمایاں رہی ہے۔اتر پردیش اردو اکادمی، فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی اور دیگر کئی بڑے ادبی اداروں کے پروگرام شہر کی ادبی سرگرمیوں کا اہم حصہ رہے ہیں۔ وہیں مقامی سطح پر بزمِ صفی قدیم، بزمِ شمس جدید، بزمِ امکان، بزمِ تاجدارِ حرم، بزمِ قلمکارانِ اودھ، بزمِ احساسِ ادب، میراثِ ادب، بزمِ شبلی، ادبی نشیمن، بزمِ لاریب، بزمِ راہی، دائرۂ کشش، بزمِ صائم، بزمِ معراجِ حرم، بزمِ دبستانِ اہلِ قلم، سخن آشنا، وقارِ ادب اور بزمِ احبابِ اُردو سمیت کئی دیگر ادبی تنظیمیں اردو ادب کو فروغ دینے میں پوری طرح سرگرم ہیں۔موجودہ دور میں سوشل میڈیا نے بھی اردو ادب کے فروغ کے لیے نئے امکانات پیدا کیے ہیں۔اس کے باوجود ادبی اداروں کی فعال سرپرستی اور انتظامی استحکام کو اردو کے مستقبل کے لیے ضروری قرار دیا جارہا ہے۔

موجودہ دور میں شہر میں واصف فاروقی، خوشبیر سنگھ شاد، چرن سنگھ بشر، ملک زادہ جاوید، تشنہ اعظمی، حسن کاظمی، رام پرکاش بیخود، سنجے مصرا شوق، منیش شکلا، ابھیشیک شکلا، رحمت لکھنوی، رفعت شیدا صدیقی، عرفان لکھنوی، معید رہبر، سلیم تابش اور فاروق عادل سمیت متعدد شعرا اپنی تخلیقی سرگرمیوں سے اردو روایت کو آگے بڑھا رہے ہیں مگر سرکاری سطح پر شعرا و ادبا کی مالی امداد و حوصلہ افزائی کے دیگر اقدام پر قدغن لگا ہوا ہے۔ اس کی اہم وجہ سرکاری فلاحی اداروں کے تئیں حکومت کی عدمِ توجہی ہے۔اتر پردیش محکمۂ لسانیات کے تحت چلنے والی اتر پردیش اردو اکادمی کا سالانہ بجٹ ساڑھے پانچ کروڑ روپے ہے مگر اس کی مجلسِ عاملہ کی تشکیل 10 ستمبر 2023 سے التوا میں ہے جس کے باعث گذشتہ چار برسوں کے انعامات کا اعلان، طلبہ کی اسکالرشپ میں اضافہ، نئی کتابوں کی اشاعت، کمزور اور مستحق ادیبوں کے وظیفوں کی منظوری، اردو کے فروغ کے لیے نئی اسکیموں کا آغاز اور ملازمین کا پرموشن جیسے کئی اہم امور التوا میں ہیں۔اسی طرح فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کا سالانہ بجٹ ایک کروڑ 30 لاکھ روپے ہے اور اس کی بھی مجلسِ عاملہ کی تشکیل 10 ستمبر 2024 سے تعطل کا شکار ہے جس کی وجہ سے منصوبوں اور کاموں پر اثر پڑ رہا ہے اور اردو حلقوں میں تشویش پائی جارہی ہے۔

معروف شاعر تشنہ اعظمی کا کہنا ہے کہ اگرچہ لکھنؤ میں ماضی جیسی شان و شوکت کے ساتھ بڑے مشاعروں و دیگر ادبی سرگرمیوں کی تعداد کم ہوئی ہے۔ سیاسی مفاد کے مدِ نظر کچھ اہلِ ثروت کی جانب سے بھی آل انڈیا مشاعرے ہوتے رہے ہیں جو 2014 کے بعد سے تقریباً معدوم ہو چکے ہیں، لیکن ادبی انجمنیں اور نوجوان شعرا اُردو زبان و ادب کی روایت کو زندہ رکھنے کے لیے مسلسل سرگرم ہیں۔ ان کے مطابق ادبی اداروں کو مضبوط بنانے سے اردو کے فروغ کے امکانات مزید بڑھ سکتے ہیں۔لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر جاں نثار عالم کا کہنا ہے کہ ماضی کے مقابلے میں آج لکھنؤ میں اردو سرگرمیوں کی وہ وسعت نہیں رہی، تاہم صورتِ حال مکمل طور پر مایوس کن بھی نہیں ہے۔ ان کے مطابق اردو کے کئی ادبی ادارے اپنے سربراہان سے محروم ہیں، لیکن یونیورسٹی کی سطح پر سمینار، سمپوزیم، ورکشاپ اور عالمی کانفرنس وغیرہ کا انعقاد جاری ہے اور تحقیق و تدریس کے میدان میں بھی نمایاں کام ہورہا ہے۔اردو حلقوں کا مطالبہ ہے کہ اتر پردیش اردو اکادمی اور فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی سمیت اردو سے متعلق اداروں کی مجلسِ عاملہ کی جلد تشکیل کی جائے تاکہ یہ ادارے فعال انداز میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے اپنا کردار ادا کرسکیں۔

(انقلاب۔دہلی)

چنار بک فیسٹول میں قومی تعلیمی پالیسی پر مذاکرہ

سری نگر/دہلی: چنار بک فیسٹول 2026 کے تیسرے دن (20 جولائی) بھی مختلف علمی اور ادبی سرگرمیاں انجام دی گئیں جن میں 'قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تحت سہ لسانی فارمولہ اور کثیر لسانی تعلیم' کے عنوان سے آتھر کارنر میں ایک اہم مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس مذاکرے میں پروفیسر افشار عالم، پروفیسر نصیر اقبال نے بطور پینلسٹ اور پروفیسر اعجاز محمد شیخ نے موڈریٹر کے طور پر شرکت کی۔

موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے پروفیسر افشار عالم نے ہندستان میں نافذ کی جانے والی پرانی قومی تعلیمی پالیسیوں اور نئی تعلیمی پالیسی 2020 کے درمیان مطابقت اور تبدیلیوں کو واضح کیا۔انھوں نے کہا کہ قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے نفاذ سے طالب علموں کے لیے زبانوں کے انتخاب کا پیٹرن تبدیل ہوگیا ہے۔اس پالیسی میں مادری زبان کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔اس کے علاوہ لسانیات اور انڈین نالج سسٹم پر بھی خاص توجہ دی گئی ہے۔انھوں نے نئی تعلیمی پالیسی اور انڈین نالج سسٹم کے درمیان ربط پر بھی اظہارِ خیال کیا۔انھوں نے کہا کہ ہندستان میں حکومتی سطح پر مختلف غیر ملکی یونیورسٹیوں کو جگہ دی جارہی ہے تاکہ دیگر زبانوں سے ہندستانی زبانوں کا رشتہ مضبوط ہوسکے اور انگریزی کے ساتھ علاقائی زبانیں بھی ترقی کرسکیں۔

دوسرے مہمان مقرر پروفیسر نصیر اقبال نے کشمیر یونیورسٹی میں نئی تعلیمی پالیسی کے اطلاق کے حوالے سے کئی کارآمد نکات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی نافذ کرنے والے اداروں میں کشمیر یونیورسٹی کو اولیت حاصل ہے۔اس یونیورسٹی میں نئی تعلیمی پالیسی کے مطابق ایک سال کا پی جی کورس بھی شروع کیا جارہا ہے۔انھوں نے مزید کہا کہ قومی تعلیمی پالیسی کی وجہ سے مقامی زبانوں پر توجہ دی جانے لگی ہے اور یونیورسٹی بھی اس کے لیے بھرپور کوشش کررہی ہے۔ (...بقیہ صفحہ 7 پر)

رفتید ولے نہ از دلِ ما

پروفیسر تاج انور

نئی دہلی۔معروف ماہرِ تعلیم اور مرزا غالب کالج گیا کے بانی صدر شعبۂ اُردو پروفیسر تاج انور کا 25 جولائی 2026 کی شب ہولی فیملی اسپتال میں انتقال ہوگیا۔وہ 88 برس کے تھے اور گزشتہ کچھ عرصے سے علیل تھے۔ نمازِ جنازہ بعد نمازِ ظہر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے احاطے میں ادا کی گئی جس کے بعد انھیں جامعہ ملیہ اسلامیہ قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ پروفیسر تاج انور نے مگدھ یونی ورسٹی سے وابستہ مرزا غالب کالج گیا میں طویل عرصے تک تدریسی خدمات انجام دیں اور شعبۂ اردو کے بانی صدر رہے۔ان کے انتقال پر مرزا غالب کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد علی حسین، ڈاکٹر قاسم فریدی، ڈاکٹر احمد کفیل سمیت متعدد اساتذہ، ادیبوں اور سماجی شخصیات نے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے مرحوم کی علمی، ادبی اور تعلیمی خدمات کو سراہا۔ ان کا کہنا تھا کہ پروفیسر تاج انور کے انتقال سے علمی و ادبی حلقوں کا ایک مخلص اور بے لوث استاد ہم سے جدا ہوگیا۔

مہرو جعفر

لکھنؤ۔لکھنؤ کی پہلی خاتون صحافی، مصنفہ اور سماجی کارکن مہرو جعفر کا 28 جولائی 2026 کو گوا میں انتقال ہوگیا۔اُن کی عمر تقریباً 75 برس تھی۔ پس ماندگان میں دو بیٹے ہیں۔ تدفین گوا میں ہی عمل میں آئی۔ مہرو جعفر کے انتقال کی خبر سے صحافتی، ادبی، ثقافتی اور سماجی حلقوں میں گہرے رنج و غم کی لہر دوڑ گئی۔ وہ کئی دہائیوں سے صحافت، ادب، تاریخ، بین المذاہب ہم آہنگی اور لکھنؤ کی گنگا جمنی تہذیب کے فروغ کے لیے سرگرم تھیں۔ مہرو جعفر کا شمار ملک کی اُن ممتاز صحافیوں میں ہوتا تھا جنھوں نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہندستان کی تہذیب، صوفی روایت، خواتین کے مسائل، سماجی انصاف اور ثقافتی ورثہ جیسے موضوعات پر گہرا اور معیاری قلمی سرمایہ چھوڑا۔ انھوں نے انگریزی کے متعدد معروف اخبارات و جرائد میں مضامین تحریر کیے اور اپنے منفرد تحقیقی و تجزیاتی اسلوب کے باعث ادبی و صحافتی حلقوں میں نمایاں مقام حاصل کیا۔

مہرو جعفر کا تعلق لکھنؤ کے ایک علمی و ثقافتی خانوادے سے تھا، لکھنؤ میں ہی ان کی پرورش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد لکھنؤ یونی ورسٹی سے انگریزی ادب کی تعلیم حاصل کی۔ وہ معروف فلم اداکارہ فرخ جعفر کی صاحبزادی تھیں، جب کہ ان کے والد سیّد محمد جعفر صحافت اور سیاست سے وابستہ تھے۔انھوں نے آزادی کے بعد اتر پردیش کی صحافت میں نمایاں کردار ادا کیا اور یوپی قانون ساز کونسل کے رکن بھی رہے۔مہرو جعفر نے لکھنؤ کی تہذیبی شناخت، تاریخی ورثے اور مشترکہ ثقافت کے تحفظ کے لیے مسلسل آواز بلند کی اور اس موضوع پر متعدد مضامین اور کتابیں تحریر کیں۔ ان کی تصنیفات میں 'لکھنؤ: اے شیڈو آف دی پاسٹ 1857-2007' کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی، جس میں انھوں نے لکھنؤ کی تاریخ، تہذیب اور سماجی ارتقا کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا۔اس کے علاوہ انھوں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حضرت نظام الدین اولیا اور سیرتِ نبویؐ سے متعلق بھی اہم کتابیں تصنیف کیں جنھیں علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔مہرو جعفر نے کچھ عرصہ آسٹریا میں بھی تدریسی اور تحقیقی خدمات انجام دیں، جہاں انھوں نے جنوبی ایشیا، اسلام اور صوفی روایت پر لکچر دیے۔ وہ مختلف بین الاقوامی علمی و ثقافتی پلیٹ فارم پر ہندستان کی مشترکہ تہذیب اور صوفیانہ روایات کی موثر صحافت کے ساتھ ساتھ سماجی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہیں۔خواتین کے حقوق، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، تعلیم، ثقافتی ورثے کے تحفظ اور انسانی اقدار کے فروغ کے لیے ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحومین کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : نحویاتِ غالب
مصنف : ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط
اشاعت : 2025
ضخامت : 364 صفحات
قیمت : 1000 روپے
ملنے کا پتا : سٹی بک ڈپو، قصاب باڑہ، مسجد محمد علی روڈ، مالیگاؤں (ناسک) مہاراشٹر
تبصرہ نگار : ڈاکٹر ابراہیم افسر

E-mail: ibraheem.siwal@gmail.com.

اُردو کے ہر دل عزیز شاعر مرزا غالب کی وفات کے بعد ان کے کلام کی متعدد شرحیں اور فرہنگیں منظرِ عام پر آئیں۔ شارحینِ غالب نے متعدد زاویوں اور جہتوں سے مرزا کے کلام کو پرکھا اور جانچا ہے۔ اکیسویں صدی میں بھی غالب کے کلام کو گرامر کی کسوٹی پر جانچنے اور پرکھنے کا یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ عہدِ حاضر میں ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے اپنی معرکہ آرا کتاب 'نحویاتِ غالب' کے ذریعے اس سلسلے کو مزید تقویت پہنچائی ہے۔ انھوں نے زیرِ نظر کتاب میں غالب کے کلام کو 'علمِ نحو' (Syntax) کی روشنی میں کامیابی کے ساتھ پرکھا اور جانچا ہے۔ موصوف نے غالب کے کلام کو 'علمِ نحو' کے تحت پرکھنے کی روداد کو اپنے دیباچے میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غالب شناسوں نے شائقینِ غالب کو سہولت بہم پہنچانے کے لیے کلامِ غالب کی شرحیں اور فرہنگیں ترتیب دیں، تحقیق و تدوین کے بڑے بڑے ادارے غالب کے نام پر قائم ہوئے، جہاں کلامِ غالب اور سیرتِ غالب کے مختلف گوشوں پر کام ہونے لگا۔ ان اداروں کی بیشتر مطبوعات، ماہرینِ غالب کی کتابیں اور غالب کی صد سالہ برسی پر ہندو پاک میں شائع ہونے والے رسائل کے 'غالب نمبر' جب جب میرے مطالعے میں آئے، مجھے ان میں کلامِ غالب کے لسانی مطالعے پر سیر حاصل مطالعے کا فقدان نظر آیا۔" (ص 9) یہی بات ڈاکٹر یحییٰ نشیط کے دل میں گھر کر گئی اور انھوں نے کلامِ غالب کو نحویات کی میزان پر پرکھنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس کتاب کی تیاری کے لیے انھوں نے مولانا حسرت موہانی، سہا مجددی، امتیاز علی خاں عرشی، شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ وغیرہ کی نگارشات کو پیشِ نظر رکھا تاکہ لسانی و اسلوبیاتی مباحث پر آسانی کے ساتھ تبادلۂ خیال کیا جا سکے۔

ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط نے زیرِ نظر کتاب کو نو ابواب میں تقسیم کیا ہے جن میں (1) کلامِ غالب کا نظامِ اسما (2) غالب کی روشن ضمیری (3) صفاتِ غالب کی تحقیق (4) غالب کا شعری تفاعل (5) کلامِ غالب میں امدادی افعال (6) کلامِ غالب میں تمیزی افعال (7) کلامِ غالب میں حرفِ زارُ سے' (8) غالب اور حرف ظرف (9) کلامِ غالب کا نحوی نظام قابلِ ذکر ہیں۔ نشیط صاحب نے اپنے مقدمے 'نحویات کیا ہے؟' میں 'علمِ نحو' پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ موصوف نے زبان کی تشکیل کے بعد لغت اور لسانیات کے باہمی ربط و ضبط کے علاوہ صوتیات (Phonetics)، صرفیات (Morphology)، معنیات (Semantics)، اسلوبیات (Stylistics) کے علاوہ جملوں کی تشکیل کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ نحویات (Syntax) کے بارے میں انھوں نے لکھا کہ کسی بھی زبان کے تقریری یا تحریری جملوں کے اجزا کے بامعنی جملوں کے علم و ساخت کا تجزیہ علمِ نحویات کے زمرے میں شامل ہے۔ اس کے لیے انھوں نے باہمی ربط تنظیم، ترکیب کی مثالیں قارئین کے سامنے پیش کیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنی بات کو وزن دار بنانے کے لیے امریکی ماہرِ زبان داں نوم چامسکی کی کتاب Syntactic Structures کی مثالوں کو شاملِ مقدمہ کیا۔ انھوں نے قارئین کی سہولت کے لیے الفاظ اور اجزائے کلام یعنی (1) اسم (2) ضمیر (3) صفت (4) فعل (5) متعلقِ فعل اور (6) حرف میں جزئیاتی عناصر میں ہونے والی تبدیلیوں کو جدول کی شکل میں سمجھایا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے 'یادگارِ غالب' اور 'خطوطِ غالب' کا بھی سہارا لیا۔ نشیط صاحب نے 'نسخۂ عرشی دیوانِ غالب' اور 'رموزِ غالب' میں موجود رموزِ اوقاف، اضافت اور کسرے کی غلطیوں کی جانب بھی واضح اشارے کیے۔ انھوں نے 'نسخۂ عرشی' میں موجود شعر:

زلفِ سیہ، افعی نظر بد قلمی ہے
ہر چند خطِ سبز زمرد رقمی ہے

کے بارے میں لکھا کہ یہ شعر مولانا عرشی اور گیان چند جین کے نسخوں میں شامل ہے لیکن اوقاف و کسرۂ اضافت کے اعتبار سے دونوں میں اختلاف موجود ہے، جس وجہ سے شعر کی قرأت میں نمایاں فرق آیا۔ انھوں نے مزید لکھا کہ عرشی صاحب افعی نظر اور بد قلمی (ٹیڑی میڑھی تحریر) زلفِ سیہ کے دو اوصاف مانتے ہیں جب کہ جین صاحب لفظ 'نظر' کو کسرۂ اضافت کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں۔ دوسرے مصرعے میں دونوں 'سبز اور زمرد' کے درمیان واو عطف یعنی 'سبز و زمرد' کو موزوں گردانتے ہیں۔ درآں حالیکہ واو عطف کے بغیر شعر کے معنی بالکل صاف ہیں۔ 'علمِ نحو' کی اس طرح کی مثالیں موصوف نے اپنے مقدمے میں جگہ جگہ پیش کی ہیں۔

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے 'کلامِ غالب کا نظامِ اسما' کے تحت غالب کے اشعار میں درآئے اسما پر تنقیدی و تحقیقی گفتگو کی ہے۔ اس کے لیے انھوں نے اُردو قواعد کی پانچ اقسام، اسمِ عام، اسمِ خاص، اسمِ جمع، اسمِ مادہ یا اسم غیر شماری اور اسم مجرد کی مثالیں بھی پیش کیں۔ نشیط صاحب نے 'دیوانِ غالب' کے پہلے شعر:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کا نحوی تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھا کہ اس شعر میں غالب نے اسما یعنی نقش، تحریر، کاغذ، پیرہن، پیکر، تصویر اور فریاد اور شوخ اسمائے مجرد کے سہارے پوری حکایات بیان کر دی ہے۔ انھوں نے اس کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا کہ پہلے مصرع میں فریاد کرنا ایک فعل ہو سکتا تھا لیکن غالب نے اسے فاعل میں تبدیل کر دیا۔ اشتقاق کے اس عمل سے اسم، فاعل میں بدل گیا۔ نشیط صاحب نے اس شعر کے بارے میں یہ بھی لکھا کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس شعر میں استعمال کیے گئے اسما کو صنعت مراعات النظیر کی روشنی میں آنکنے کی کوشش کی ہے اور شعر کو انشائیہ بیان سے تعبیر کیا ہے۔ (ص 43)

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے 'غالب کی روشن ضمیری' کے تحت کلامِ غالب میں موجود ضمیر شخصی، ضمیر متکلم، ضمیر حاضر، ضمیر غائب، ضمیرِ موصولہ، ضمیر معکوس، ضمیر استفہامیہ، ضمیر نکرہ، ضمیر اشارہ، ضمیر تعظیمی، ضمیر اضافی، ضمیر اضافی مشترکہ اور تمیزی یا متعلق فعلی ضمیری کو طشت از بام کیا ہے۔ انھوں نے کلامِ غالب میں موجود ضمائر کی حالت، صیغۂ واحد، صیغۂ جمع، ضمائر کی اشتقاقی صورت، صفت مقداری اور اس کی غیر معینہ صفت عددی کی نشان دہی کرتے ہوئے مدلل بحث کی ہے۔ موصوف نے مرزا غالب کے درج ذیل شعر:

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

میں صفت ذاتی پر بحث کرتے ہے لکھا کہ اس شعر میں شاعر نے اپنی ذاتی صفات کو قارئین کے سامنے بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے 'غالب کا شعری تفاعل' میں کلامِ غالب میں موجود فعل لازم، فعل ناقص اور فعل متعدی پر اپنا مطمح نظر واضح کیا۔ اس ضمن میں انھوں نے کلامِ غالب سے مثالیں بھی پیش کیں۔ دیوانِ غالب کے قصیدے کے شعر:

تین تیوہار اور ایسے خوب
جمع ہر گز ہوئے نہ ہوں گے کہیں

کے بارے میں لکھا کہ اس شعر میں 'جمع' اسم جمع ہے اور 'ہونا' فعل اصلی۔ ان دونوں کے جڑنے سے 'جمع ہونا' مرکب فعل بن گیا ہے۔ شاعر تین تیوہاروں کو یک جا آنے کی بات کہہ رہا ہے۔ نحوی لحاظ سے 'جمع ہونا' ماضی مطلق کا فقرہ ہے۔ 'کلامِ غالب میں امدادی افعال' کے حوالے سے ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے کلامِ غالب میں موجود اُردو کے امدادی افعال یعنی لینا، دینا، آنا، جانا، پڑنا، بیٹھنا، اُٹھنا، لگنا، دکھانا، گزرنا، مرنا مارنا، پانا، ڈوبنا، رکھنا، چلنا، نکلنا، کرنا، بننا، رہنا، ڈالنا، سکنا، ہونا، چلا آنا، چلا جانا، چاہنا، ہے اور تھا پر تبادلۂ خیال کیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے نظم طباطبائی، مولوی عبدالحق اور مرزا خلیل احمد بیگ کی آرا کو بھی شاملِ کتاب کیا ہے۔ موصوف نے مرزا غالب کے درج ذیل شعر:

جاتے ہوئے کہتے ہو، قیامت کو ملیں گے
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

میں موجود امدادی افعال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس شعر کے مصرعِ اولیٰ میں 'جاتے ہوئے' کے فقرے میں 'ہوئے' جانے کے عمل کی نشان دہی کرتا ہے۔ یعنی اس سے 'جاتے وقت' کے معنی نکلتے ہیں۔ اس معنی میں 'ہوئے' امدادی فعل ہوگا۔

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے زیرِ نظر کتاب میں کلامِ غالب کا نحوی مطالعہ سائنٹفک انداز میں کیا ہے۔ انھوں نے اپنی برسوں کی تحقیق سے کلامِ غالب کا نحوی اعتبار سے گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مطالعہ کیا اور قارئین کے سامنے ایک نئی جہت 'نحویاتِ غالب' کو پیش کیا۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 'ادارہ یادگارِ غالب، کراچی' نے اسے 2024 میں شائع کیا۔ ماہرِ لسانیات و لغات ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے اپنے تاثرات میں لکھا کہ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط صاحب نے غالب کی نحویات کو اپنے خصوصی مطالعے کا موضوع بنا کر نحویاتِ غالب کے عنوان سے ایک تفصیلی کام کیا ہے جس میں غالب کے اُردو کلام میں امدادی یا معاون افعال، افعال تمیزی (یعنی متعلق فعل یا Adverb) حروف جار اور حروف ظرف کے استعمال کی وضاحت و تفہیم کلام غالب سے مثالوں کی مدد سے کی گئی ہے۔ میرے علم کی حد تک یہ اُردو میں کلام غالب کی نحوی خصوصیات کی پہلی تفصیلی تفہیم و تنقید ہے۔ اسی طرح سلیم شہزاد نے اپنے پیش لفظ 'قواعدِ زبان اور تفہیم شعر' میں ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط کی جملہ مساعی اور نحویاتِ غالب پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا کہ یہ ایک سائنسی متن ہے جس میں جملوں کی اقسام سے لے کر جملوں/شعروں کی تشریح و تعبیر پر نشیط صاحب نے ساری توجہ صرف کی ہے۔ جملے کی قواعدیت اور غیر قواعدیت کے مسائل انھوں نے غالب کے شعروں کی روشنی میں حل کیے ہیں اور تشریح و تعبیر میں نظم طباطبائی، سہا مجددی، حسرت موہانی، اور شمس الرحمٰن فاروقی کے متون سے ماخوذ حوالوں کو تنقید کی کسوٹی پر کسا ہے۔ سیّد صبیح الدین صبیح رحمانی (صدر ادارہ یادگارِ غالب، کراچی) نے لکھا کہ ادبی دنیا میں پچاس برس سے مصروف عمل ڈاکٹر نشیط کا تازہ کارنامہ 'نحویاتِ غالب' کی صورت میں منظرِ عام پر آیا ہے... زیرِ نظر تصنیف نے جہاں غالب کی عظمت کو ایک بار پھر اُجاگر کیا ہے وہیں ڈاکٹر صاحب موصوف کی ژرف نگاہی بھی محبان غالب کے سامنے آتی ہے۔

بہر نوع، ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے پوری دیانت داری، ایمانداری، لگن اور خلوص کے ساتھ کلامِ غالب کا نحوی مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے

شارحینِ غالب کے یہاں اشعار میں موجود کسرہ، اضافت اور املا کی گرفت کی۔ یہ بات ان کے وسیع مطالعے اور مشاہدے کی علامت ہے۔ دورِ حاضر میں علمِ نحوی کے تحت اشعار کی تفہیم و تعبیر کی جانب غفلت برتی جارہی ہے۔ لیکن ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے اپنی محنتِ شاقہ سے اس مشکل امر کو آسان بنا دیا ہے۔۔ یہاں پر یہ بات عرض کرنا ضروری ہے کہ ڈاکٹر موصوف اگر رشید حسن خاں کے 'گنجینۂ معنی کا طلسم [اشاریۂ کلامِ غالب]' کو بھی پیشِ نظر رکھتے تو بہتر ہوتا۔ اس اشاریے میں بھی لغت، قواعد و زبان کے اعتبار سے غالب کے کلام پر مفصل بحث موجود ہے۔ نشیط صاحب نے غالب کے اشعار میں موجود تہ داری کو نحوی مطالعے سے سہل بنایا ہے۔ امید قوی ہے کہ ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کے اس عظیم کارنامے کو اہلِ علم قدر کی نظر سے دیکھیں گے۔ ساتھ ہی ہم امید کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اسی طرح دوسرے شعرا کے کلام کا نحوی مطالعہ بھی کتابی قالب میں پیش کریں گے۔

◆◆◆

مسائلِ لغت و قواعد اور رشید حسن خاں کے فکری ابعاد

(بقیہ صفحہ 3 سے آگے)

آتے ہیں اور اٹکل سے کام لینا پڑتا ہے۔ بہ طورِ مثال محسنؔ کے اُس قصیدے کو لیجیے: سمتِ کاشی سے چلا... اِس میں کئی اشعار وضاحت طلب ہیں۔ انشاؔ کے کلام میں ایسے بہت سے شعر ملیں گے، مثلاً شیو کے گلے سے پاربتی جی لپٹ گئیں۔ کیا ہی بہار آج ہے برمھا کے انڈ پر (شعر یادداشت سے لکھا ہے)۔ زنّار کس قدر عام لفظ ہے، مگر اِس کے متعلقات بہت کم کو معلوم ہوں گے، میں ہی نہیں جانتا کہ کب باندھتے ہیں، کیوں باندھتے ہیں کس طرح باندھتے ہیں۔ اُس کے پیچھے خیال کیا ہے۔ تاگا کیسا ہوتا ہے، گرہیں کیسی ہوتی ہیں۔ غیر برہمن باندھ سکتا ہے؟ اُتارتے کب ہیں، اُس کی شرائط کیا ہیں۔ باندھتے وقت تقریب کیسی ہوتی ہے۔ بس یہ سمجھیے کہ انسائیکلو پیڈیا کے انداز کی کتاب ہو، ہر اندراج حوالے کے ساتھ اور ہر حوالہ مستند۔ اُردو والے ہندو اساطیر سے بہت کم واقف ہیں اور جتنی واقفیت ہے بھی، وہ ادھوری ہے۔ نثری کتابوں کا احوال بھی یہی ہے۔ جگہ جگہ ایسے حوالے آجاتے ہیں۔ لکشمی اور سرسّتی نام کی حد تک ہم واقف ہیں، مگر اُن سے متعلق ضروری تفصیلات معلوم نہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ ایک ہزار یا خیر، پانچ سو سہی، اندراج ایسے ہوں گے جو کئی صفحوں پر مشتمل ہوں گے۔ اس کا عنوان ہوگا: اُردو ادب میں مستعمل ہندو مذہب کے اصطلاحی اور اساطیری الفاظ کا توضیحی لُغت۔ یہ بڑا کام ہے اور بہت اہم کام ہے۔ ہندی میں ایسا لُغت چھپ چکا ہے، نام اُس کا مجھے یاد نہیں، مگر میں نے اُسے دیکھا ہے، اُسے سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ کالی داس گپتا رضا کے پاس ایک قدیم لُغت اِس موضوع پر میں نے دیکھا تھا، وہ پُرانے انداز کا ہے، مگر بہت معلوماتی ہے، اُسے بھی سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ جاٹ مراتب جانیے جب تیرھویں ہو جائے۔ مجھے نہیں معلوم کہ 'تیرھویں' کیا ہوتی ہے اور کیسے ہوتی ہے، عقلی گدّ الگا سکتا ہوں اور بس۔ ایسے معلوم نہیں کتنے لفظ ہیں۔ تناسخ کو لیجیے، عام معنی ہم سب کو معلوم ہیں مگر قطعیت کے ساتھ اور حوالے کے ساتھ اس کے متعلقات نہیں معلوم۔ غرض کہ یہ عمدہ موضوع ہے، اُسے کر ڈالیے۔ اب ایسے کام کرنے والے گویا اُٹھ گئے ہیں۔''[۴۰]

رشید حسن خاں نے 22 جولائی 1967 کو مشفق خواجہ کے نام لکھے خط میں اس بات کا مژدہ سُنایا کہ اُن کا ایک اہم مضمون 'اختلافِ املا اور لُغت' اُردو نامہ کراچی میں جلد شائع ہوگا، لیکن انھیں اس بات کی بھی فکر ہے کہ دو ماہ گزرنے کے بعد بھی اُردو نامہ، کراچی کی جانب سے کوئی تصدیق نامہ نہیں آیا کہ مضمون شائع ہوگا یا نہیں۔ رشید صاحب کا مذکورہ مضمون 'املا کا ختلاف اور لُغت' اُردو نامہ، کراچی شمارہ :29، اکتوبر 1967، ص 67 تا 82 شائع ہوا تھا۔ مضمون کے آخر میں شان الحق حقی نے نوٹ لگاتے ہوئے لکھا کہ فاضل مضمون نگار نے املا کے جن مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے بلا شبہ اہم ہیں اور ہم اُن کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اس موضوع پر بہ طورِ خاص ہم سے تخاطب فرمایا۔ ہمیں اپنے کام کے آغاز میں املا کے مسئلے سے سابقہ پڑا تھا اور ہم نے یہ مجمل اصول اختیار کر لیا تھا کہ املا کو مصنف سے منسوب نہیں کیا جائے گا، لیکن ظاہر ہے کہ مسئلہ اس سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ احتیاط سے تیار کیے ہوئے اڈیشنوں کی عدم موجودگی اور مخطوطات تک رسائی نہ ہونے کے سبب ہمارے لیے اس کا سرانجام اور بھی دشوار ہو گیا ہے۔ بہر حال ہم اس اختلاف املا کو ضرور ملحوظ رکھتے ہیں جس سے تلفظ کا اختلاف ظاہر ہوتا ہو، نیز وہ املا جو مصدقہ طور پر مصنف سے منسوب کیا جا سکے۔ باقی بہت سے اختلاف نظر انداز کر دیے گئے ہیں[۴۱]۔ مشفق خواجہ کے نام لکھے خط کا وہ اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں رشید صاحب نے اپنے مضمون کو اُردو نامہ، کراچی میں شائع ہونے کے بارے میں لکھا ہے:

''آپ جلد ہی میرا ایک مختصر مضمون 'اختلافِ املا اور لُغت' کے عنوان سے ملاحظہ کریں گے اور مجھے اُمید ہے کہ آپ اسے پسند بھی کریں گے۔ یہ اب سے بہت پہلے 'اُردو نامے' کو بھیجا گیا تھا کیوں کہ یہ اُنھیں کے لُغت سے متعلق تھا، لیکن یار لوگوں نے اب تک اِسے شائع نہیں کیا، بلکہ رسید بھی دو مہینے کے بعد بھیجی۔ عجیب لوگ ہیں۔ کوئی شخص اعتراض سُننے کے لیے تیار ہی نہیں۔ اللہ جانے اِس کا حشر کیا کریں گے۔''[۴۲]

رشید صاحب نے مشفق خواجہ کے نام 26 مئی 1976 کو ایک طویل خط لکھا۔ اس خط میں عربی، فارسی کے الفاظ اور ان کا لُغت میں تذکیر و تانیث کے استعمال پر مفصل بحث شامل ہے۔ یہاں تک کہ اس بحث میں الفاظ کے درست استعمال اور دلیل کے طور پر کلاسکل اُردو شعرا کے اشعار کو بارہا شامل کیا گیا۔ علاوہ ازیں عربی و فارسی زبان کے جملوں کے استعمال پر بھی تبادلۂ خیال کیا گیا۔ خط کے آخر میں رشید صاحب نے احسان دانش کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ وہ اچھے شاعر ہیں انھیں قواعدِ اُردو پر زورِ طبع کرنے کی ضرورت نہیں۔ رشید صاحب کے مطابق احسان دانش لُغت کو مونث لکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ تذکیر و تانیث پر کیا کتاب لکھیں گے۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ احسان دانش نے دستورِ اُردو نام سے کتاب لکھی تھی جس کے سرنامے پر 'اُردو نثر کے تصنیفی و تالیفی کارناموں اور روز مرہ کے ان اغلاط کی اصلاح و تحقیق جو تقریر و تحریر کے طول و عرض پر حاوی ہیں اور زبان و قلم کی ہر سعی کو معیارِ فصاحت سے گرا دیتے ہیں' عبارت تحریر کی۔ یہ کتاب مکتبہ دانش، مزنگ لاہور سے 1951 میں شائع ہوئی۔ احسان دانش نے اس کتاب کی تیاری کے لیے دریاے لطافت، کیفیہ، ضروری المبتدی فارسی، علم اللسان، گنجینۂ تحقیق، اصلاح ادب، اختلاف اللسان، زبان دانی اُصولِ لُغت اور دستور فصاحت سے استفادہ کیا۔ اس کے علاوہ احسان دانش کی اُردو قواعد سے متعلق دوسری کتاب 'تذکیر و تانیث' ہے جس کا ذکر رشید صاحب نے اپنے طویل خط میں کیا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار مارچ 1970 میں مرکزی اُردو بورڈ، لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں تذکیر و تانیث سے متعلق کُل 34 ابواب قائم کیے گئے۔ اس کتاب کے حوالے سے رشید صاحب کے خط کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اور ہاں خواجہ صاحب! یہ احسان دانش صاحب کو کیا ہو گیا کہ قواعد پر زورِ طبع صرف کرنے لگے، جس ٹائپ کی شاعری کیا کرتے تھے، وہی کرتے رہتے تو کیا بُرا تھا۔ اُس کی مشق بھی ہو گئی تھی۔ بور کرنے کے لیے وہی شاعری کیا کم تھی کہ اب وہ ستم ظریفی پر بھی اُتر آئے ہیں۔ معلومات کا حال یہ ہے کہ خود لُغت کو مونث استعمال کرتے ہیں اور تذکیر و تانیث پر کتاب لکھتے ہیں۔ نقل در نقل اور وہ بھی بے سلیقگی کے ساتھ اور ناواقفیت کے عناصر سے گراں بار۔ احسان صاحب کو غزل کہنا تو خیر آتی نہیں، وہ اِس گوں کے نہیں، مگر اُن کا ایک شعر حافظے میں محفوظ ہو کر رہ گیا ہے۔ خوب کہا ہے۔ جب بھی یاد آتا ہے تو ایک خاص واقعے کا نقشا آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، شعر یہ ہے:

سحر ہوتے ہی وہ اِس طرح شرما کر سدھارا ہے
کہ مجھ کو عمر بھر اب رنجِ تنہائی گوارا ہے

مزے کا شعر ہے۔ بس اس ایک شعر کے علاوہ اور کچھ نہیں۔''[۴۳]

حواشی:

۳۶ رشید حسن خاں کے خطوط (جلد دوم) مرتب ڈاکٹر ٹی.آر. رینا، اُردو بک ریویو، نئی دہلی نومبر 2015، ص 365-366

۳۷ ایضاً، ص 616-617

۳۸ خطوطِ مالک رام، مرتبہ شمیم جہاں، ثمر آفسٹ پرنٹرس، نئی دہلی، 1992، ص 209

۳۹ رشید حسن خاں کے خطوط (جلد چہارم)، مرتبہ ڈاکٹر ٹی.آر. رینا، اپریل 2026، ص 103

۴۰ ایضاً، ص 169

۴۱ رسالہ اُردو نامہ، کراچی، شمارہ :29، اکتوبر 1967، ص 82

۴۲ رشید حسن خاں کے خطوط (جلد چہارم)، مرتبہ ڈاکٹر ٹی.آر. رینا، اپریل 2026، ص 279

۴۳ ایضاً، ص 315

(باقی آئندہ)

چنار بک فیسٹول میں قومی تعلیمی پالیسی پر مذاکرہ

(بقیہ صفحہ 5 سے آگے)

مذاکرے کے اختتام سے قبل قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے اختتامی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہر ادارے کی سرگرمیاں ایک خاص تقاضے کے مطابق سامنے آتی ہیں۔ قومی اردو کونسل نے تعلیم کے میدان میں نئی تعلیمی پالیسی 2020 کے تقاضوں کے تحت کئی اہم خدمات انجام دی ہیں اور اس بات پر خاص توجہ دی ہے کہ اردو کا رشتہ ہندستان کی دیگر زبانوں سے مضبوط کیا جا سکے۔

اس مذاکرے کو پروفیسر اعجاز محمد شیخ نے موڈریٹ کرتے ہوئے اس کا تعارف بھی پیش کیا اور کئی اہم سوالات قائم کیے جن کی روشنی میں مہمان مقررین سے قومی تعلیمی پالیسی کے تحت سہ لسانی فارمولہ اور کثیر لسانی تعلیم کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں آسانی ہوئی۔ انھوں نے اس پالیسی کے اطلاق اور نفاذ کے متعلق بھی استفسار کیا جن کے تحت اہم تجاویز سامنے آئیں۔

مذاکرے کے بعد شام چار بجے کلچرل اسٹیج پر ایک شاندار مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں ملک کے مختلف حصوں سے تشریف لانے والے معروف و معزز شعراے کرام نے اپنے خوب صورت کلام سے نوازا۔

انعام لودھی اور ان کے قلمی کارناموں پر ایک نظر

عارف عزیز

’قلـم‘ دُنیا کی بیش بہا دولت پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے۔ صدیوں سے انسان کی عظمت و برتری کا راز اسی قلم میں مضمر ہے اور اس کا استعمال کر کے ہر چھوٹا اور بڑا قلم کار اپنی فکر ونظر سے قلم کے ورثے میں اضافہ کرتا ہے جب کہ قلم کار اور قاری کے درمیان ربط و تعلق کا وسیلہ ذرائع ابلاغ انجام دیتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن تو موجودہ عہد کی دین ہیں، اس سے قبل ذرائع ابلاغ کا کام اخبارات و رسائل کیا کرتے تھے، جن کی اہمیت آج بھی کم نہیں ہوئی ہے۔ اگر اخبار ورسائل نہ ہوں تو قلم کار کی تخلیق بے معنی اور ترسیل بے محل ہوجائے۔ یہی وجہ ہے کہ واٹس ایپ اور فیس بک کے روز افزوں استعمال کے باوجود آج بھی پرنٹ میڈیا کا اثر ورسوخ قائم ہے یعنی سیاہ وسفید کے درمیان چھپے ہوئے الفاظ کی حیثیت مسلم ہے۔ یہ اخبار ہی ہیں جو قوم کی بیداری کے تھرمامیٹر کا کام کرتے ہیں اور ان کو مرتب کرنے والے یعنی اہل و ذمے دار صحافی قوم کے بلند کردار کے ترجمان ہوتے ہیں۔

اردو اخبارات کی تاریخ ایسے روشن دماغ اور بے مثال صحافیوں سے بھری پڑی ہے، جنھوں نے ملک کی آزادی کی تحریک سے لے کر اسے بنانے اور سنوارنے میں اپنی توانائیاں صرف کی ہیں اور صحافت کے جس شعبے میں قدم رکھا، وسائل کی کمی کے باوجود اہم نقش چھوڑے ہیں۔ عزیز گرامی انعام اللہ خاں لودھی بھی ان صحافیوں میں شامل ہیں جو کم وبیش چالیس برس تک اردو صحافت کی خدمت میں مصروف رہے۔

موصوف سے میرے کئی رشتے ہیں اور ہر رشتے کی اٹوٹ بنیاد ہے۔ یہ تہذیبی، سماجی نظریاتی، جذباتی اور برسوں پرانی رفاقت پر مبنی ہیں۔ وہ مجھ سے عمر میں بڑے ضرور ہیں لیکن ہمیشہ بے تکلف دوست کا برتاؤ روا رکھا ہے۔

انعام لودھی اس خوش رنگ بھوپالی تہذیب وروایات کے پروردہ ہیں جس کی سوندھی خوشبو دور تک پہنچتی ہے۔ مالوہ کی روایتی ملنساری، بھوپال کی کشادہ دلی، خود اعتمادی اور حق گوئی کی یہ چلتی پھرتی مثال اردو صحافت میں ہمارے شہر کی نمائندگی کا حق ادا کر رہی ہے۔ یوں تو انعام بھائی نے شاعری ہو، افسانہ نگاری ہو، شخصیات پر مضامین ہوں، ادب کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی ہے، تاہم ان کی قلمی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار اگر کسی شعبے میں ہوا ہے تو وہ اسپورٹس پر مضامین اور کھیل کی رپورٹنگ ہے، جس نے ایک خلقت کو ان کا گرویدہ بنا دیا، خاص طور پر روزنامہ ’آفتابِ جدید‘ بھوپال کے صفحات پر بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں تو ان کے قلم کا ڈنکا بجتا تھا، صبح ہوتے ہی قارئین کی بڑی تعداد اخبار کے کھیل کی خبریں پڑھنے کے لیے اس کی ورق گردانی شروع کر دیتی تھی۔ انعام لودھی نے ’آفتاب جدید‘ کے صفحہ نمبر 5 اور سنڈے اڈیشن کے کھیل کالم میں سات برس تک جو لکھا، اسے نوجوانوں نے ہی نہیں عمر رسیدہ قارئین نے بھی دل لگا کر پڑھا اور پسند کیا ہے۔

اس کا تجربہ بارہا ہوا کہ اخبار کے دوسرے ساتھیوں کے مقابلے میں لوگوں کی زبان پر انعام لودھی کا نام زیادہ رہتا تھا۔ اس زمانے میں ٹی وی عام نہیں ہوا تھا، لوگ ریڈیو سنتے اور دوسرے دن اخبار میں خبر پڑھ کر اندازہ لگاتے کہ اسپورٹس رپورٹر نے کس حد تک کھیل کی رپورٹنگ کا حق ادا کیا ہے۔ انعام لودھی یو این آئی اور پی ٹی آئی انگریزی ایجنسیوں سے خبروں کا رواں دواں ترجمہ کرنے اور ان پر چست سرخیاں لگانے میں ڈوبے رہتے، شہر میں کہیں ٹورنامنٹ ہوتا تو اس کی رپورٹنگ کے لیے گراؤنڈ پر جاتے، رات گئے تک اخبار کے آفس میں ان کے دم سے چہل پہل رہتی اور کھیل کے پرستاروں کا آنا جانا لگا رہتا۔ انعام لودھی کے قلم سے کھیل کی سرگرمیوں پر ہونے والے تبصرے وتجزیے کا بھی شائقین کو انتظار رہتا۔ جب بھوپال میں عبیداللہ خاں گولڈ کپ ہاکی ٹورنامنٹ کا سیزن آتا یا اولمپک، کامن ویلتھ اور ایشین گیمس ہوتے تو انعام بھائی کی مصروفیت دیکھنے کے قابل ہوتی۔ وہ چاہتے کہ پورا اخبار اسپورٹس کے لیے مخصوص ہو جائے۔ ’آفتابِ جدید‘ کے بعد ہندی ’دینک جاگرن‘، روزنامہ ’افکار‘ (اردو اور ہندی)، روزنامہ ’بھوپال ٹائمز‘ ’دینکساندھیہ پرچار‘، ’مدھیہ پردیش سندیش‘ اور آخر میں روزنامہ ’ندیم‘ وہ اخبارات ورسائل ہیں جن میں انعام لودھی نے اسپورٹس رپورٹر کی حیثیت سے کام کیا یا مضامین لکھے، ان کے علاوہ ملک وبیرون ملک کے دوسرے اخبارات ورسائل بالخصوص کراچی ولاہور میں بھی ان کی تحریریں شائع ہوتی رہیں، جن سے کھیل کے مختلف موضوعات پر ان کی قدرت ومقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہاکی وہ کھیل ہے جس نے بھوپال کی شہرت کو دور دور تک پہنچایا ہے۔ انعام لودھی نے ہاکی پر بے تکان لکھا ہے۔ ان کے مضامین اخبارات کی فائل میں دبے ہوئے ہیں، نظرثانی کے بعد انھیں کتابی شکل میں شائع ہونا چاہیے کیوں کہ ہندستان کے اس مقبول اور بھوپال کے محبوب کھیل پر کوئی مستقل کتاب نہیں ہے، نہ موجودہ نسل ہاکی اور اس کے کھلاڑیوں کے کارناموں سے واقف ہے۔ انعام لودھی نے اپنے عہد کے نامور کھلاڑیوں سے کیے گئے انٹرویوز میں بھی حاضر دماغی کا مظاہرہ کر کے سوال وجواب کا جو معرکہ سر کیا ہے، اس میں بھی ہاکی ہو یا کرکٹ، کھیلوں کی تاریخ وتہذیب سمٹ آئی ہے۔ اسی طرح انھوں نے نوجوان اور ابھرتے کھلاڑیوں کے انٹرویوز لے کر یا ان پر مضامین لکھ کر نئی نسل کی حوصلہ افزائی کا اہم کام کیا ہے لہٰذا مذکورہ انٹرویوز کی اشاعت بھی مفید ثابت ہوگی۔ کم لوگوں کو علم ہوگا کہ انعام لودھی اسپورٹس رائٹر کے علاوہ، اچھے مترجم بھی ہیں، ان کی اس صلاحیت کا اظہار خبروں کے ترجمہ کے علاوہ ہندی اور انگریزی کے مضامین کو اردو قالب پہنانے اور اردو تحریریں دوسری زبانوں میں منتقل کرنے میں بھی ہوتا ہے۔ ہندی کے ماہنامہ ’دین مبین‘ کے لیے ہندی میں مذہبی مضامین برسوں سے وہی ترجمہ کر رہے ہیں، ان کے لکھنے اور ترجمہ کرنے کی صلاحیت کی بنا پر انھیں الفاظ کی ٹکسال قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اس زود نویسی سے اکثر ان کی تحریر کا بہاؤ متاثر ہو جاتا ہے۔

انعام لودھی کا 2021 میں اپنے اساتذہ پر مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے، جو میری معلومات کے مطابق اساتذہ پر تحریر اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس کی اشاعت کے بعد دیر آید درست آید کے مصداق مدھیہ پردیش اردو اکادمی کا اردو صحافت پر حکیم قمر الحسن آل انڈیا ایوارڈ انھیں تفویض ہوا۔ 2022 میں ان کے تحریر کردہ مضامین کا دوسرا مجموعہ ’بھوپال کے ادبی جواہرات‘ کے عنوان سے مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے مالی تعاون سے پھر منظرِ عام پر آیا ہے، اس کے مضامین جن کی تعداد 71 ہے، انعام لودھی نے وقتاً فوقتاً رقم کیے ہیں۔ یہ مضامین عہد حاضر کی اہم اور قابلِ ذکر شخصیات پر مشتمل ہیں، انھیں پڑھ کر جہاں ان کی عظمت اور اپنے اپنے شعبوں میں اثرات سے آگاہی ہوتی ہے، وہیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انعام لودھی نے کسی کے بارے میں تنقیدی رویہ یا منفی اندازِ فکر اپنانے میں احتراز کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی ان مضامین کے مطالعے سے پورے عہد کی تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

20- گھاٹی بھڑ بھونجہ روڈ، تلیا، بھوپال-462001
E-mail:arifazizbpl@rediffmail.com
Mob. No. 9425673760

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

مدیر : **اطہر فاروقی**
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
معاون مدیران : منور حسن کمال، سالم فاروق ندوی
Assisistant Editors :
Munawwar Hasan Kamal, Salim Farooq Nadwi
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-٦
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002 and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***